دنیائے تصوّف کا پہلا اردو ناول

بادہ و ساغر

''شاہ صاحب آپ نے تو سوڈا واٹر کی بوتل میں آبِ زم زم مِلا دیا ہے۔''

اکبر الہ آبادی

سید شاہ محمد ذوقیؒ

مقدمہ و پیش کش: ڈاکٹر ذوالفقار علی دانش

بادہ و ساغر

سید شاہ محمد ذوقیؒ

مقدمہ و پیش کار

ڈاکٹر ذوالفقار علی دانش

معاون

کرن سنگھ

ضابطہ

کتاب: بادہ وساغر (ناول)

مصنف: سید شاہ محمد ذوقیؒ

مقدمہ و پیش کار: ڈاکٹر ذوالفقار علی دانش

اشاعتِ اوّل: ۱۹۵۵ء

اشاعتِ ثانی: ۲۰۱۳ء

ناشر: ادارۂ پہچان، میر پور خاص

سرورق: اسد شوکت، میر پور خاص، ۰۳۳۳-۲۹۸۸۴۱۱

قیمت: ۳۵۰ روپے

بیرون ممالک: ۸ڈالر / ۵پونڈ

مشینی کتابت: فیصل احمد (کتابی دنیا) ۰۳۴۱۲۶۹۸۰۵۷

ملنے کا پتا

کرن سنگھ -۴۸، سوامی نارائن مندر، ایم اے جناح روڈ، کراچی۔

ذوالفقار علی دانش۔G-16، النصیر اسکوائر، شریف آباد فیڈرل بی ایریا نمبر 1، کراچی۔

منظر بک ڈپو- دکان نمبر ۱، پولس شاپنگ سینٹر میر پور خاص، فون: ۰۳۳۳-۲۶۸۵۶۶۲

اکادمی بازیافت- کتاب مارکیٹ، آفس نمبر ۱۷، گلی نمبر ۳، اردو بازار کراچی۔ فون: ۳۲۷۵۱۴۲۸ (۰۲۱)

ویلکم بک پورٹ - اردو بازار، کراچی۔ فون: ۳۲۶۳۳۱۵۱ / ۳۲۶۳۹۵۸۱ (۰۲۱)

فکشن ہاؤس، نوشین سینٹر، فرسٹ فلور، دکان نمبر ۵، اردو بازار کراچی، لاہور، حیدر آباد

احمد سعید قائم خانی ایڈوکیٹ نے تاج چیمبرس، نیو ٹاؤن، میر پور خاص سے شائع کی۔

فہرست

بادہ وساغر کی کہانی	۵
سید شاہ محمد ذوقیؒ کے حالاتِ زندگی	۷
مقدّمہ	۹
بادہ وساغر	۳۷
دیباچہ	۱۸۹

☆☆☆☆☆

خالی صفحات

۴ ، ۳۲، ۱۹۸، ۱۹۹ اور ۲۰۰ کو خالی کرنا ہے۔اور صفحے کے نیچے سے پہچان ۲۵ مٹانا ہے۔شروع کے دو صفحات تبدیل کرنے ہیں۔

بادہ وساغر کی کہانی

مَیں (فون پر): ذوالفقار دانش عرض کر رہا ہوں۔ مجھے سید شاہ محمد ذوقیؒ کی کچھ کتب درکار ہیں۔
وہ: آپ تین تلوار کراس کر کے دو تلوار والے پیٹرول پمپ کے قریب آ جائیں، مَیں پک کر لوں گا۔
آپ کب تشریف لائیں گے؟
مَیں: کل آ جاؤں گا۔ ۳۰۔۱۱ بجے دن میں۔
وہ: ٹھیک ہے۔
مَیں (میزبان کی بیٹھک میں): مجھے سید شاہ محمد ذوقیؒ کی مضامین ذوقیؒ، شمامۃ العنبر، حج ذوقیؒ اور بادہ وساغر چاہیے۔
وہ: تربیت العشاق اور سرِّ دلبراں ہیں؟ بادہ وساغر کے علاوہ سب مل جائیں گی۔
مَیں: جی وہ دونوں ہیں۔ بادہ وساغر کیوں نہیں؟ اگر آپ کے پاس کوئی نسخہ ہو تو فوٹو کاپی کرا دیں۔
وہ: ہے تو سہی، مگر اس کی اجازت نہیں۔
مَیں: میرے پی ایچ۔ڈی کا مسئلہ ہے اور مَیں نے اس ناول کا ذکر کتابیات میں اور زبانی بھی تخصیص کے ساتھ کر دیا ہے۔
وہ: ہم سے پوچھ کر تو آپ نے نہیں کیا۔
مَیں: مگر آپ کی شائع کردہ ذوقیؒ صاحب کی کتابوں میں اس کا نام دیکھ کر کیا ہے۔
وہ: یہ بات صحیح ہے مگر ہم مجبور ہیں۔ کتاب نہیں دے سکتے۔ اجازت نہیں ہے۔
مَیں: مجھے یہیں پڑھنے کے لیے دے دیں۔ مَیں نوٹس لے لوں گا۔
وہ: یہ بھی نہیں ہو سکتا۔
مَیں: کسی اور جگہ یا کسی اور سے مل سکتی ہے؟
وہ: ناممکن ہے۔
مَیں: روحانیت میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔ مَیں خواجہ شمس الدین کا مرید اور قلندر بابا اولیاؒ میرے دادا مرشد ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ناول مجھے ضرور ملے گا اور مَیں اس کے ملنے کی اطلاع آپ کو دوں گا۔
وہ: مسکراتے ہوئے، طلب سچی ہو گی تو مل جائے گا۔
بعد ازاں کراچی کے کتب خانوں میں ''بادہ وساغر'' کو تلاش کیا۔ سینئر ادیبوں کو فون کیے۔ مگر بادہ وساغر کی سرشاری سے محروم رہا۔ اب پی ایچ۔ڈی سے زیادہ اس کے بارے میں فکر مند

ہوا۔ پھر مقصود کے حصول میں جنگل کی طرف نکل گیا۔ جہاں آباد شہر میں مراد سے بہرہ مند ہوا۔ فوٹو کاپی کرائی، خوشی خوشی گھر لوٹا۔ جلد بنوائی، پھر پتا چلا چار صفحات کم ہیں۔ پروفیسر طارق جمیل کی معرفت پروفیسر رابعہ خاتون نے چاروں صفحات اسکین کر کے ای میل کیے۔ جس قوم کے افراد میں فروغِ علم کے لیے ایسا جذبہ ہو۔ وہ ضرور ترقی کرتی ہے۔ ہمارے کالجز، جامعات، کتب خانوں کے منتظمین، اساتذہ، محققین اور لائبریرین نے ایسی سہولت دینے کا ابھی سوچا بھی نہیں ہے۔ آسانی فراہم کرنا، صوفیہ کا فلسفہ اور عمل رہا ہے۔

ذوقیؔ صاحب نے ''بادہ وساغر'' ۱۹۲۰ء میں لکھا، پہلی اور آخری بار ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ ناول بوجوہ قارئین تک رسائی حاصل نہیں کر سکا۔ اس کی اہمیت اور وقعت کا اندازہ اکبرالہ آبادی کی اس رائے سے کیا جا سکتا ہے جو آپ نے مطالعے کے بعد اس پر دی تھی۔

''شاہ صاحب آپ نے تو سوڈا واٹر کی بوتل میں آبِ زم زم مِلا دیا ہے۔''

میرے علم کے مطابق یہ دنیائے تصوّف کا پہلا اردو ناول ہے۔ اس کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ اِس میں پیش کردہ علامتی اسلوب، اردو ناول نگاری میں اولین کاوش ہے۔

ناول میں جابجا مختلف شعرا کے اردو اور فارسی اشعار دیے گئے ہیں۔ بیش تر فارسی اشعار کا اردو ترجمہ پروفیسر پیر نثار احمد جان سرہندی اور چند اشعار کا ترجمہ پروفیسر نجمی نے کیا ہے۔ کتاب میں موجود فارسی اشعار میں کتابتی خامیوں کی نشان دہی دونوں مترجمین نے فرمائی، اس لیے ان تراجم میں کچھ کسر رہنے کے امکانات ہیں۔ قارئین ان کی درستی اور دیگر خامیوں کے لیے ہمیں مطلع فرمائیں تا کہ آئندہ ان کی تصحیح کی جا سکے۔ ہم ان دونوں صاحبان کے شکر گزار ہیں۔ ناول کی پہلی اشاعت کا املا قدیم رنگ لیے ہوئے ہے۔ لفظوں کو غیر ضروری مِلا کر تحریر کیا گیا، جیسے لیجانے، ابتک، سمجھدار، بچپین وغیرہ اسی طرح داوٗ پیچ، تمہیں، اوچاٹ، پہونچیں وغیرہ۔ موجودہ اشاعت میں انھیں رائج املا کے مطابق کر دیا گیا ہے۔

پیش کار

☆☆☆☆☆

سید شاہ محمد ذوقیؒ کے حالاتِ زندگی

شاہ سید محمد ذوقیؒ (وصال ۹، ذی الحج ۱۳۷۰ھ/۱۳، ستمبر ۱۹۵۱ء): شاہ سید محمد ذوقیؒ کی ولادت ۱۵/ستمبر ۱۸۷۷ء/ ۷ رمضان ۱۲۹۴ھ بروز ہفتہ کھوری ضلع ساگر میں ہوئی، نام سید محمد ابراہیم رکھا مگر آپ کو سید محمد ہی کے نام سے پکارا جاتا رہا اور سید محمد ذوقی خود بھی یہی نام استعمال کرتے تھے۔ ان کے والد سید ابو محمد جمال الدینؒ کا انتقال دسمبر ۱۹۱۴ء میں ہُوا، آپؒ کا سلسلہ نسب حضرت امام حسینؓ سے ملتا ہے۔ ابتدائی تعلیم کھوری میں حاصل کی، عربی والد صاحب سے سیکھی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں سعادتِ حج دس سال کی عمر میں عطا کی اور آپ والدین کے ہم راہ حج پر گئے۔ ۱۲سال کی عمر میں حصولِ علم کے لیے جبل پور بھیجا گیا، وہاں تین سال قیام فرمایا، اس کے بعد علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی، جہاں مولانا محمد علی جوہر آپ کے ہم جماعت تھے۔

سید محمد ذوقیؒ کی شادی ۱۹۹۶ء میں ہوئی، کچھ عرصے تک ملازمت کرتے رہے۔ ایڈیٹر مخزن شیخ عبدالقادر کے کہنے پر صحافت کا شعبہ اختیار کیا۔ وطن، پیسہ اخبار، انتخاب لاجواب اور بچوں کے اخبار میں کام کرنے کے بعد حیدرآباد سندھ کے ہفت وار انگریزی اخبار ''الحق'' میں ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۷ء تک ایڈیٹر رہے۔ آپؒ ایک بے باک اور صاف گو شخصیت کے مالک تھے۔ اس لیے اخبار ''الحق'' کے مالکان سے نہیں بن سکی، انھوں نے ''الحق'' کو ایک معیار عطا کیا تھا، جس کی بدولت آپ کو مسلم پریس کی جانب سے لارڈ کرزن نے جارج پنجم کے دورۂ ہندوستان کے سفر کے لیے منتخب کیا، پھر دو سال تک ''الوکیل'' کی ادارتی ذمّے داری نبھائی۔ بمبئی میں تجارت کا کام شروع کیا، جسے بعد ازاں دہلی منتقل کیا۔ دہلی منتقلی سے قبل آپؒ کی شریکِ حیات کا انتقال بھی ہو گیا تھا، جس سے انھیں بہت صدمہ ہُوا تھا۔

سید محمد ذوقی کے باطنی سفر کا آغاز ۱۹۱۳ء میں ہُوا، اِس سال آپ اجمیر شریف تشریف لے گئے تھے پھر مختلف مقامات پر بزرگوں سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ ۲۸ نومبر ۱۹۱۳ء میں مولانا وارث حسن شاہؒ سے شرفِ ملاقات حاصل ہُوا، جن کے دستِ مبارک پر آپ نے ۱۶ فروری ۱۹۱۴ء کو

بیعت کی، جنھوں نے روحانی اور باطنی تربیت کی پھر مرشد کے حکم پر ایک بیوہ سے عقد ثانی کیا۔۱۹۱۹ء میں مولانا وارث شاہؒ نے آپ کو خلافت سے نوازا۔آپ نے اجمیر، جے پور، پشاور، بمبئی اور آگرہ میں بھی قیام فرمایا۔قیامِ بمبئی کے دوران آپ نے تصوّف کے مضامین پر مبنی ایک رسالہ "انوارالقدس" بھی جاری کیا، جس نے دادِ تحسین حاصل کیا۔یہ رسالہ اکتوبر ۱۹۲۵ء سے فروری ۱۹۲۷ء تک جاری رہا۔پشاور میں چھوٹے بھائی سید احمد کے انتقال کے بعد آپ حیدرآباد دکن تشریف لے گئے، جہاں دسمبر ۱۹۳۰ء سے ۵ مارچ ۱۹۴۰ء تک قیام رہا۔قیام دکن کے دوران آپ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے خلیفہ بابا شرف الدینؒ کے مزار پر حاضری دیا کرتے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد ۷ ستمبر ۱۹۴۷ء کو سید محمد ذوقیؒ اپنے متعلقین کے ہم راہ اجمیر سے کراچی تشریف لائے۔ملیر میں سکونت اختیار کی۔پاکستان آنے کے بعد پاک پتن میں بابا فریدؒ کے عرس میں شرکت فرمائی۔۲۸ مئی ۱۹۵۱ء کو حج کے سفر پر روانہ ہوئے۔میدانِ عرفات میں خطبہ کے اختتام پر آپ کی طبیعت خراب ہوئی اور ۹ ذی الحج ۱۳۷۰ھ/۱۳، ستمبر ۱۹۵۱ء کو ملکِ عدم کے لیے رخصت ہوئے۔وہیں آپ کا مدفن ہے۔آپؒ نے شاہ شہید اللہ فریدیؒ کو اپنا روحانی جانشین مقرر کیا تھا، آپ کی دو صاحب زادیاں پہلی بیوی سے حاجرہ خاتون اور دوسری بیوی سے راشدہ خاتون ہوئیں، آخری الذکر کا عقد شاہ شہید اللہ فریدیؒ سے ہُوا تھا۔

سید محمد ذوقی کی تصانیف میں معرکہ آرا کتاب "سرِ دلبراں" ہے، یہ اصطلاحاتِ تصوف پر مفصل بحث پر مبنی ہے، اس کے علاوہ مضامینِ ذوقی (اردو)، مضامین ذوقی (انگریزی)، بادہ و ساغر (روحانی ناول) اور تربیۃ العشاق (ملفوظات)، صوفی ازم (انگریزی) اہم ہیں۔آپ کے حج کا سفر نامہ "حجِ ذوقی" کیپٹن واحد بخش سیال نے مرتب کیا ہے۔

سید محمد ذوقی نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور اس کے مختلف اہم عہدوں پر فائز رہے۔پروشنل ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کے نائب صدر، آل انڈیا کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔جن اکابرین سے آپ کی ملاقاتیں ہوئیں۔ان میں قائدِ اعظم، لیاقت علی خان، ذاکر علی اور حسن نظامی، اکبرالہ آبادی شامل ہیں۔مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی آپ کے دوستوں میں سے تھے۔

پیش کار

❁ ❁ ❁

''بادہ وساغر'' دنیائے تصوّف کا پہلا اردو ناول

ڈاکٹر ذوالفقار علی دانش

صوفیانہ تعلیمات کے فروغ اور عوام النّاس کی اصلاح کے لیے مختلف اصناف اختیار کی گئیں۔ اِن میں مکتوبات، ملفوظات، مضامین، تذکرہ نگاری، حکایات اور شاعری خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ فارسی شاعری میں شمس تبریزؒ، مولانا رومؒ، حافظؒ اور شیخ سعدیؒ کا کلام تصوّف اور اخلاقیات کا ایسا منبع قرار پایا کہ جس نے بیک وقت علمائے کرام کی محافل اور صوفیۂ کرام کی مجالس میں اپنی جائے خاص حاصل کی۔

شاعری میں اس قدر صوفیانہ مضامین کو برتا گیا کہ غیر صوفی شعرائے کرام نے بھی ان موضوعات کو اپنے کلام کا جزو بنایا۔ اردو میں قلی قطب شاہ، ولی دکھنی، میر تقی میر، مرزا غالب، علامہ اقبال، اصغر گونڈوی وغیرہ کے ہاں ان مضامین کو بہ آسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ شاعری میں یہ روایت اس قدر مستحکم نظر آتی ہے کہ علی حزیںؔ کا درجِ ذیل مصرع مبنی بر حقیقت نظر آتا ہے۔

ع تصوّف برائے شعر گفتن خوب است

صوفیۂ کرام نے انسانی دل چسپی کے پیشِ نظر الہامی تعلیمات اور اخلاقی پہلوؤں کو عوام النّاس کے دلوں میں نقش کرنے کے لیے حکایات اور قِصص کو بھی وسیلۂ اظہار بنایا۔ مولانا رومؒ کی مثنوی میں پیش کردہ واقعات کو نثری قالب میں ڈھالا گیا۔ شیخ سعدیؒ کی گلستان و بوستان کی حکایات کی اہمیت و وقعت مسلّم رہی ہے۔ فریدالدّین عطّارؒ کی ''منطق الطّیر'' میں پرندوں کی زبان میں حکیمانہ نکتے بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں کہانی پن اور دل چسپی کا عنصر پایا جاتا ہے۔

اردو زبان وادب کا اوّلین نثری شہ کار ''سب رس'' میں تماثیل کے ذریعے نکتہ ہائے تصوّف کو افشا کیا گیا۔ اسی طرح دیگر اردو داستانوں میں بھی اخلاقی تعلیمات اور صوفیانہ افکار کہیں کہیں دکھائی

دیتے ہیں۔ جب داستانوی اسلوب اپنی عمرِ طبعی مکمل کر چکا تو اس کی جگہ پر ناول برا جمان ہوا۔
اردو ناول کی ابتدا ۱۸۶۹ء میں ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے تحریر کردہ ناول ''مراۃ العروس'' سے ہوئی۔ یہ صنف دیگر اصناف کی نسبت دقت طلب تھی اور ہے۔ اس لیے اس صنف کے لکھاریوں کی تعداد بہ نسبت دیگر اصناف بہت کم رہی۔ شاید یہ بھی ایک وجہ ہو کہ یہ صنف صوفیۂ کرام کی توجہ حاصل نہیں کر سکی۔ اسی لیے اردو میں خصوصاً اور دیگر زبانوں میں عموماً خانقاہی اور تصوّفانہ ادب (۱) میں ناولوں کا ذخیرہ قابلِ اعتنا نہیں ہے۔
ڈاکٹر قمر رئیس نے پریم چند کے ناول ''چوگانِ ہستی'' پر رائے دیتے ہوئے لکھا تھا کہ ''روحانیت کا مابعد الطبیعات نظام ناول کا موضوع نہیں ہو سکتا۔'' (۲) ادب کی بیش تر اصناف کے موضوع کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنے کا عمل، اُس صنف میں تجربات کرنے سے روکتا ہے۔ البتہ وہ اصناف جن کے موضوعات ان کے ناموں سے متّھی ہیں، ان پر حدود کی پابندی لازم ہے۔ جیسے حمد، نعت، شہر آشوب، مرثیہ، واسوخت، سوانح، خاکہ وغیرہ۔ ناول جیسی صنف جس میں ضخامت کی گنجائش بہ نسبت دیگر اصناف زیادہ ہے۔ اس کے موضوعات کی حدود کا تعیّن آسان نہیں ہے۔ ضخامت اور فنّی حوالے سے ناول کو دیکھا جائے تو یہ وہ صنف ہے جس میں تصوّف کے موضوعات اور مباحث کو مفصل اور وضاحت سے پیش کرنے کے امکان موجود ہیں۔ البتہ اس صنف پر طبع آزمائی کرنے کے لیے غیر معمولی تخلیقی جوہر اور فنی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔
اردو کے خانقاہی ادب میں سیّد شاہ محمد ذوقیؒ نے ۱۹۲۰ء میں پہلا ناول ''بادہ وساغر'' کے نام سے لکھا۔ اس ناول کی اشاعت آپ کے وصال (۹، ذی الحج ۱۳۷۰ھ/۱۳، ستمبر ۱۹۵۱ء) کے بعد ۱۹۵۵ء میں ہوئی۔ ناول کے سرورق پر ذوقی اور اندرونی صفحۂ اوّل پر مصنف کے نام میں ''گم نام ونشان'' درج ہے۔ جس کی توجیہ دیباچے میں دی گئی ہے۔
ناول ''بادہ وساغر'' نہ صرف کتابوں کی دکانوں پر دست یاب نہیں ہے بلکہ عوامی اور نجی لائبریریوں میں بھی کم یاب ہے۔ اس کم یابی کی دو وجوہ ہیں: اوّل اِس ناول کی اشاعتِ ثانی نہ ہو سکی۔ دوم سلسلۂ ذوقی کے بزرگوں نے اس ناول پر پابندی عائد کر دی۔ آخری الذّکر بات راقم کو

سلسلے کے ایک اہم ذمّے دار نے بیان کی۔ ناول پر پابندی کی شدّت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ناول کی موجودگی کے باوجود راقم کو اس کے دیدار سے بھی محروم رکھا گیا۔ ممکن ہے یہ پابندی ناول کی اشاعت کے فوراً بعد لگائی گئی ہو۔ اور ناول کی تقسیم وفروخت بند کردی گئی ہو۔ اس بابت ذوقی صاحبؒ کے عقیدت مندوں سے یہ سہو مستقل ہوتا رہا کہ وہ اس ناول کا اشتہار مصنف کی دیگر کتب میں دیتے رہے۔ یہی سہو اس ناول کی اشاعتِ ثانی کا سبب بنا ہے۔ بے شک اللہ اپنے محبوب بندوں کے حالات اوران کی نشانیوں کو قائم رکھتا ہے۔

ناول کی قدر وقیمت کا تعیّن اکبرالہ آبادی کی اس رائے سے کیا جاسکتا ہے کہ ''شاہ صاحب آپ نے تو سوڈا واٹر کی بوتل میں آبِ زم زم ملا دیا ہے۔'' (۳)

اکبرالہ آبادی کی اس رائے کے حوالے سے تین سوالات اٹھتے ہیں۔ اوّل یہ رائے اکبرالہ آبادی کی ہے یا نہیں؟ اس سوال کا سبب یہ ہے کہ اکبرالہ آبادی کے نام سے سرسید احمد خان کا تصور ابھرتا ہے اور ذوقی صاحبؒ کا وصال قیامِ پاکستان کے بعد ہُوا۔ اس لیے زمانی بعد محسوس ہوتا ہے۔ دوّم اکبرالہ آبادی کا تصوّف سے کس قدر تعلّق تھا؟ دوسرے سوال کی وجہ وہ رائے ہے جو اکبرالہ آبادی نے ''بادہ و ساغر'' پر دی ہے۔ کیا وہ تصوّف سے اس قدر شغف رکھتے تھے کہ اس ناول پر ایسی جامع رائے دے سکیں۔ سوّم یہ رائے موجودہ دور میں بیش تر کتب کے فلیپ پر موجود رسمی تعریفی تحریروں کی طرح ہے یا مبنی برحقیقت ہے؟ اس سوال کا تعلّق ناول کے تجزیے سے ہے۔

اکبرالہ آبادی کا انتقال ۹، ستمبر ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ پیش لفظ کے مطابق ناول ۱۹۲۰ء میں لکھا گیا۔ (۴) گویا یہ رائے امکانات میں سے ہے۔ اس کے علاوہ اکبرالہ آبای سے ذوقی صاحبؒ کے تعلقات کا پتا ''تربیت العشّاق'' کے مقدمے سے بھی چلتا ہے۔ (۵) یہ مقدمہ واحد بخش بی۔ اے نے نومبر ۱۹۵۲ء میں تحریر کیا ہے۔ جب کہ اکبرالہ آبادی کی رائے کو محمد حسین برے نے ''بادہ وساغر'' کے تعارف میں پیش کیا ہے۔ (۶) یہ دونوں حضرات ذوقی شاہؒ کے مریدین میں سے ہیں۔ اس لیے یہ رائے قابلِ تحقیق ہوسکتی ہے۔ اس ضمن میں یہ بات دیکھی جائے کہ کیا اکبرالہ آبای سے ذوقی شاہؒ کے تعلقات کس قدر تھے؟ مذکورہ بات کی تصدیق سوانح اکبرالہ آبادی سے ہوتی ہے جو

ان کے فرزند سید عشرت حسین کی تحریر کردہ ہے۔اس سوانح یعنی ''حیاتِ اکبر'' کو اکبرالہ آبادی کے پوتے اور سید عشرت حسین کے فرزند سید مسلم رضوی نے شائع کیا۔حیاتِ اکبر میں لکھا ہے کہ

''ڈاکٹر اقبال کے علاوہ ان حضرات سے بہت رسم وراہ اور خط و کتابت تھی۔سر سید احمد خان، سر اسرار حسن خان، سر سپرو، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت مدن موہن مالوی، سر عزیز الدین، احمد صاحب، عزیز لکھنوی مرحوم، صفی لکھنوی مرحوم، نوروی، سر عبدالقادر، خواجہ حسن نظامی، مولوی عبدالماجد دریا آبادی، ذوقی شاہ صاحب۔''(۷)

گویا اکبرالہ آبادی کی ناول کے بارے میں رائے میں صداقت ہے۔

جہاں تک اکبرالہ آبادی کے تصوّف سے تعلق کی بات ہے۔ان کے گھرانے کا ماحول صوفیانہ تھا۔اُن کے والد ''سید تفضل حسین صوفی منش انسان تھے۔عبادت وظائف میں مصروف رہتے تھے۔''(۸) اکبر پر ان کے اثرات مرتب ہوئے۔اس لیے ان کی شاعری میں تصوّف اور عرفان کی جھلک نمایاں رہی۔(۹) شاعری میں مضامین تصوّف کا بیان تو ایک عرصے تک معمول کی بات رہی۔اس لیے ممکن ہے اکبرالہ آبادی نے بھی ''تصوّف برائے شعر گفتن خوب است'' کے تحت تصوّف کو شاعری کا موضوع بنایا ہو۔یہی نہیں، اکبرالہ آبادی کے خطوط سے بھی اُن کے تصوّف سے گہرے تعلق کا معلوم ہوتا ہے۔کیوں کہ خطوط وہ داخلی شہادت ہے۔جس سے کسی بھی شخص کے نظریات اور مختلف پہلوؤں پر نقطۂ ہائے نظر سے درست آگہی حاصل ہو جاتی ہے۔جب اکبرالہ آبادی اپنے چودہ سالہ فرزند ہاشم کی وفات پر بہت زیادہ غم زدہ تھے۔اُس دوران عبدلماجد دریا آبادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ''وہی لڑکا دنیاوی زندگی کا سہارا تھا۔مذہب اور فلسفۂ تصوف نے دیوانگی سے محفوظ رکھا۔''(۱۰)

جہاں تک اکبرالہ آبادی کی ''بادہ وساغر'' کے بارے میں تنقیدی رائے کا تعلق ہے۔اُس کی تصدیق و تردید ناول کے مطالعے اور تجزیے کے بعد کی جا سکتی ہے۔ہم اس رائے کو ناول کے تجزیے میں بوقتِ ضرورت بیان کریں گے۔البتہ ایک پہلو سے اس رائے کی وقعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔دیکھیے:

ناول کا آغاز انتہائی دل چسپ ہے۔ دنیا کی حسین صبح و شام کا ذکر کیا ہے۔ دل آویز صبحِ بنارس اور شامِ اودھ کے حسن میں محو ہونے والوں کو بمبئی کی شامِ چوپاٹی، اپالو اور بینڈ اسٹینڈ کی گلگشتی سے لطف اندوز ہونے کی دعوت دی گئی۔ بمبئی کو ایک ایسے شہر کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو اپنے اندر ایک مکمل دنیا رکھتا ہے۔ جیسا کہ شہرِ کراچی۔ جس میں زندگی کا ہر رنگ، کھلا یا بجھا ہوا، واضح دکھائی دیتا ہے۔

بمبئی ہو یا کراچی، یہ ایسے جنگل ہیں، جن میں داخل ہو کر بیش تر لوگ اپنی حقیقت بھول جاتے ہیں۔ ناول نگار لوگوں کو حقیقت آشنا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ حسین و جمیل مناظر کی مے نوشی سے بے خود کرانے کے بعد انھیں "وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ" (۱۱) سے آگاہی دیتے ہیں۔ ایک جھلک دیکھیے:

> "یہاں کی سیر گاہوں، یہاں کے سینما، سرکس اور تھیٹروں میں جا کر دیکھو تو خیال کرو گے کہ تفکرات اور پریشانیوں سے یہاں والوں کو کبھی سابقہ ہی نہیں پڑا۔ ایک عام چہل پہل نظر آئے گی۔ جس سے دن عید اور رات شبِ برأت کا دھوکا ہوگا مگر کان کھول کر سُن رکھو کہ یہ سب دھوکا ہے اور مسحور نگاہ کی نظر فریبی۔ مادہ پرست ہستیاں کبھی سکون و اطمینان کی زندگی بسر نہیں کرسکتیں۔ اُن کے رہنے کے لیے کیسی ہی عالی شان ایوان ہوں۔ ان کے نقل و حرکت کے لیے کیسی ہی خوش نما تیز رو اور آرام دہ سواریاں ہوں۔" (۱۲)

غالبًا اس اسلوب ہی کے پیشِ نظر اکبر الٰہ آبادی نے ناول کے بارے میں یہ کہا کہ ناول نگار نے سوڈا واٹر میں آبِ زم زم کی آمیزش کر دی ہے۔ ناول میں کئی ایسے مناظر ہیں۔ جن سے اس رائے کی تصدیق ہوتی ہے۔

ناول کی تفہیم میں مصنف کا تحریر کردہ دیباچہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس لیے اوّل اس پر بحث کی گئی ہے۔ یہ دیباچہ عمومی دیباچوں سے اس لیے منفرد ہے کہ اسے کتاب میں آغاز کی بجائے آخر

میں دیا گیا ہے۔ جس کے بارے میں مصنف کی رائے ہے کہ

"جہاں اس کتاب میں چند اور خصوصیات ہیں۔ ایک خصوصیت یہ بھی ہے
کہ دیباچہ بجائے اوّل کہ آخر میں درج ہے۔ اس میں بھی چند مصلحتیں
ہیں۔ جن کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں۔" (۱۳)

مصنف نے دیباچے کو آخر میں دینے کی مصلحت کا تذکرہ یوں بیان کر دیا کہ "یہ اوراق کم از کم دو مرتبہ کے مطالعے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جب آپ دوسری مرتبہ ان کا مطالعہ فرمائیں گے تو آخر کا دیباچہ اوّل آ جائے گا۔" (۱۴)

مصنف کے خیال میں ناول کا مطالعۂ ثانی ہی اصل مطالعہ ہے۔ بصورت دیگر اس ناول کے بعض امور تفہیم سے بالاتر رہیں گے۔ (۱۵) ناول نگار کا یہ خیال درست ہے۔ کیوں کہ اس قصّے میں جو کہانی پیش کی گئی ہے، اُس کا بیانیہ اتنا دل چسپ اور پُرتجسّس ہے کہ اس کی علامتی اور استعاراتی پہلوؤں پر خیال لے جانے پر طبیعت مائل نہیں ہوتی۔ اگر ناول کی پہلی خواندگی میں علامات اور استعارات پر غور و فکر کیا جائے تو کہانی پن میں رکاوٹیں اس طرح در آتی ہیں، جس طرح تیز رفتار گاڑی کے لیے سڑک پر رفتار شکن (speed breaker) آتے ہیں۔

سید شاہ محمد ذوقیؒ نے اس خیال کو رد کیا ہے کہ جو اس قصّے کی ہیئت دیکھ کر اسے ناول قرار دے رہے ہیں اور اسے افسانہ سمجھ رہے ہیں۔ انھوں نے اسے ناول کی بجائے سوانح عمری اور افسانے کے برخلاف حقیقت کا ترانہ قرار دیا ہے۔ (۱۶) کہانی پن اور دل چسپی کا عنصر جو اس ناول کا خاصا ہے۔ بادی النظر میں جس کا مطالعہ جی بہلانے اور وقت گزاری کا وسیلہ ہے مگر مصنف کا اصرار کہ "اسے پڑھ کر رونا آتا ہے۔ بربادیٔ وقت پر حسرت ہوتی ہے۔" (۱۷) ناول نگار کا یہ بیان اس وقت سند پاتا ہے جب دیباچے کے بعد ناول کی دوسری یا تیسری خواندگی بھرپور تفہیمی انداز میں کی جائے۔

ناول نگار کی یہ بات قابلِ تفہیم ہے کہ معنوی تہہ داری کے حامل اس ناول کو سمجھنے کے لیے دیباچے کا مطالعہ ضروری ہے۔ کیوں کہ دیباچے میں ذوقی صاحبؒ نے ناول کے متعلق کئی

اشارے دیے ہیں۔ ناول کا مقصدِ تحریر بیان کیا ہے۔ اگلی دیباچے میں آدم کی سرگزشت کو خوب صورت پیرائے میں پیش کیا ہے۔ اِس قصۂ آدم میں اس کا مقصدِ حیات کا تذکرہ بھی ہے جو ناول کا مدعائے تحریر بھی ہے۔ دیباچے میں لکھا ہے:

> "میری سرگزشت سے کوئی سبق لینا یا نتیجہ نکالنا چاہتے ہوں تو میری اس آخری نصیحت پر اللہ کا نام لے کر عمل کرنا شروع کر دیں کہ اپنے نقطۂ نظر کی اصلاح فرما کر صراطِ مستقیم پر ہو لیں اور نہایت مستعدی کے ساتھ اپنے کام میں منہمک رہیں۔" (۱۸)

پورے ناول میں چند ایک مقام پر اتنا واضح مقصد بیان کیا گیا ہے۔ ورنہ راقم کے خیال میں قصے میں گم قاری کے ذہن میں یہ بات چند لمحوں سے زیادہ نہیں رہتی ہے۔ "بادہ وساغر" کے قاری کے لیے ایک شرط یہ بھی رکھی ہے کہ اسے صرف وہی افراد مطالعہ کریں "جو میدانِ جان بازی کے پہلوان اور دریائے جان فروشی کے شناور ہیں۔" (۱۹) ان حضرات کو ناول سے دور رہنے کا مشورہ دیا گیا ہے جو دل و جان کو عزیز رکھتے ہیں اور شہرتِ دنیا کے طالب ہیں۔ (۲۰) قاری کو یہ مشورہ بھی دیا گیا ہے کہ ناول کا بغور مطالعہ کیا جائے اور اس میں پیش کردہ ظاہری دل فریبی میں اس قدر نہ گم ہوا جائے کہ باطنی حسن حجاب میں آ جائے۔ ناول نگار کا یہ بھی کہنا ہے کہ دیگر اشیا کی طرح اس ناول کا بھی ایک ظاہر اور ایک باطن ہے۔ کسی اور شے یا جگہ کے ظاہر و باطن میں اختلاف ہو سکتا ہے مگر اس کتاب یا قصے کا ظاہر و باطن ایک ہے۔ جب تک قاری ظاہر و باطن میں امتیاز نہیں کر سکیں گے۔ ناول میں پیش کردہ لذّتِ زیست سے لطف اندوز نہیں ہو سکیں گے۔ (۲۱)

"بادہ وساغر" کے بارے میں مصنف نے ایک اور پہلو کشائی کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ عموماً ایسے قصوں میں کذب پر صدق کا جامہ پہنایا جاتا ہے جب کہ مَیں نے صدق پر کذب کا تو نہیں مگر کذب نما صدق کی صورت دی ہے۔

ناول اور مصنف کے حالاتِ زندگی (۲۲) کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دیباچے میں بیان کردہ معلومات سے مفر آسان نہیں ہے۔ ناول کا آغاز حالی کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

جب محرم نہ ہوتو انسان کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔اس کا اندازہ وہ حساس اور اہلِ دل بخوبی جانتے ہیں، جن کے اردگرد روبوٹ حرکت کرتے ہوں۔باطنی سفر میں اَسرار عیاں ہوتے ہیں تو ان کے اظہار کے لیے عوام وخواص کی زبان اور الفاظ عاجز ہوتی ہے۔ایسے ہی مواقع کے لیے صوفیہ کرام نے اصطلاحات تشکیل دی ہیں۔جنھوں نے کس حد تک محرموں میں باہمی تبادلے کو آسان کیا۔ذوقی شاہؒ نے تصوّف کے رازہائے پنہاں کو بیان کرنے کے لیے ادب کی اہم اور موزوں صنف ناول کا انتخاب کیا۔ناول کی تفہیم کے لیے اس کی کہانی کا کچھ تعارف ملاحظہ کریں۔

''بادہ وساغر'' میں مصنف نے کہانی کے انداز میں صوفیانہ معاملات کو علامتی انداز میں بیان کیا ہے۔ناول کے آغاز میں مرکزی کردار واحد متکلّم سمندر کے کنارے بیٹھ کر اپنی زندگی کا تجزیہ کررہا ہے۔اس تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا تعلّق ایک مذہبی تقدّس کے حامل خاندان سے ہے۔جب کہ وہ خود ایک دنیا دار اور کاروباری شخص ہے۔جس کو بیوی کی موت اور دیگر صدمات نے مضمحل کیا ہوا ہے۔وہ دولت کمانے کی ہوس میں مبتلا ہے۔اُس کی زندگی ایک خاص ڈگر پر چل رہی ہے۔جس میں بظاہر تغیّر کے امکان نہیں ہیں۔اچانک ایک حسین وجمیل شخص اُس کے قریب آبیٹھتا ہے۔اور ڈبیا میں سے اپنی خوب صورت انگلیوں سے پان کی گلوری نکال کر ''واحد متکلّم'' کو پیش کرتا ہے جو پہلے ہی اُس کے سحرِ حسن میں گرفتار ہے۔''واحد متکلّم'' لکھنو کے بیگمی پان کی لذّت دوچند محسوس کرتا ہے۔دوسرے دن پھر اسی مقام پر طے شدہ باہمی ملاقات ہوتی ہے۔''واحد متکلّم'' دوسری ملاقات کے لیے مضطرب ہوتا ہے۔اس ملاقات میں وہ نقش ونگار سے مزیّن چاندی کی ڈبیا دیتا ہے جن میں پان کی گلوریاں ہوتی ہیں۔واحد غائب جس کا نام بعد میں ''واحد متکلّم'' سندر اس لیے رکھتا ہے کہ مردوزن دونوں جنس کے لیے موافق ہے۔سندر بتاتا ہے کہ وہ اُس کے برگزیدہ خاندان سے واقف ہے۔

تیسری ملاقات میں سندر ''واحد متکلّم'' کو ایک پرفضا مقام پر موجود مکان میں لے جاتا

ہے۔ جہاں سندر اپنا تعارف کچھ اس طرح کراتا ہے۔

"مَیں کاٹھیاواڑ گجرات کی ایک ریاست کا رہنے والا ہوں۔ ایکٹر ہوں مگر پیشہ ور ایکٹر نہیں بلکہ شوقیہ اور امیر زادہ ایکٹر۔ آپ نے سنا ہوگا کہ اس خطے میں بعض والیانِ ریاست کو تھیٹر کا بہت شوق ہے۔ انھوں نے ذاتی کمپنیاں بنا رکھی ہیں۔ جن میں اپنے احباب اور احباب زادوں کو بھی اسٹیج پر لاتے ہیں۔ مَیں اُنھی احباب زادوں میں سے ہوں۔ مجھے چوں کہ خود بھی ایکٹنگ کا شوق تھا۔ مَیں نے خاص طور پر اس فن کو حاصل کیا۔ اردو اور اردو کے لہجے کی درستی کے لیے لکھنؤ گیا۔ وہاں بیگمات کی سوسائٹی میں کچھ مدت بسر کی۔ . . . فیملی ایکٹنگ کی غرض سے عورت بننے کی کوشش کی۔ بال بڑھائے، ناک کان چھدائے، گانا بجانا سیکھا۔ کسی قدر ناچنے کی بھی مشق بہم۔" (۲۳)

ناول کے مرکزی کردار واحد متکلّم کی فرمائش پر سندر زنانہ لباس میں سج دھج کر کنیز چمیلی کے ہم راہ آتا ہے۔ چمیلی طبلے اور سندر ہارمونیم لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ "واحد متکلّم" سندر کو اس روپ میں دیکھ کر اُس کے حسن و جمال کی تعریف کرتا ہے۔ جب یہ محفلِ شباب و رباب شروع ہوتی ہے تو سندر مولانا جامیؒ کی نعت شریف سناتا ہے۔ نعت سے قبل کا پورا منظر اور ایسے موقع پر نعت اور خواجہ غریب نوازؒ کی منقبت کو راگ کے ذریعے پیش کرنا۔ اکبر اللہ آبادی کی رائے کو درست ثابت کرتا ہے۔ یعنی ذوقی شاہؒ نے سوڈے واٹر میں آبِ زم زم مِلا دیا ہے۔ ناول میں اس طرح کے کئی مناظر ہیں۔

سندر "واحد متکلّم" کو اپنی بیوی سے ملاقات کا عندیہ دیتا ہے۔ اور اُسے بتاتا ہے کہ وہ حقوقِ زوجیت ادا کرنے سے قاصر ہے اس لیے تم اس سے نکاح کر لو۔ سندر کی بیوی بلقیس بھی حسن و جمال میں آسمانی مخلوق معلوم ہوتی ہے۔ بلقیس "واحد متکلّم" کو کہانی سناتی ہے کہ وہ راجا کی بیٹی اور سندر اسی راجا کے وزیر کی اولاد ہے۔ دونوں کا جنم ایک رشی کی نظرِ کرم سے ہُوا۔ دونوں کا نکاح بھی ہندوستانی

طریقے پر رشی ہی کے حکم پر ہُوا۔ بلقیس ''واحد متکلّم'' کو بتاتی ہے کہ رشی نے ان دونوں کی ملاقات اور نکاح کی پیش گوئی اور تحریری خبر بھی دی تھی۔ ''واحد متکلّم'' سندر کی خوش نودی کے لیے بلقیس سے نکاح کی ہامی بھرتا ہے پھر بلقیس سُندر کو اپنے علاوہ تین مزید نکاح ایک ساتھ کرنے کا کہتی ہے۔ مزید تین منکوحہ یہ ہوتی ہیں۔ ایک بھتیلی شاہ جہاں، دوسہیلیاں نور جہاں اور بدر منیر۔ جب نکاح ہوجاتے ہیں تو بلقیس سندر کو شاہ جہاں کے کمرے میں لے جاتی ہے۔ وہاں شاہ جہاں کے روپ میں سندر ہوتا ہے۔ جسے رشی کے کہنے پر مردانہ روپ دیا گیا تھا اور مردانہ روپ کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے اداکاری اور اس سے متعلّق دوسرے کاموں کی تربیت دی گئی تھی۔

بدر منیر سے وصال کا وقت قریب آتا ہے تو دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہی بے ہوش ہوجاتے ہیں۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ''واحد متکلّم'' بنارس میں بدر منیر پر فریفتہ ہوجاتے ہیں۔ اُس وقت وہ حسنِ ظاہر پرست تھے۔ بدمعاشوں کے ذریعے بدر منیر کو اُٹھانے کا منصوبہ بھی بناتے ہیں۔ ایک دوست کے ہاں بدر منیر اور ان کے اہلِ خانہ کی تین روزہ دعوت میں، دوست کی منّت کر کے شریک ہوتے ہیں اور بالآخر بدر منیر کے کمرے میں پہنچ جاتے ہیں۔ بدر منیر ریوالور نکال لیتی ہے لیکن ایک بزرگ اچانک درمیان میں آتے ہیں۔ ''واحد متکلّم'' کو تنبیہ، شرمندہ اور تھپڑ لگا کر کمرے سے باہر نکال دیتے ہیں۔ اس واقعے کے بعد حدیث کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو اکبرالٰہ آبادی کی رائے کو تقویت دیتی ہے۔ اِس ذلت کے بعد ''واحد متکلّم'' بیمار ہو کر توبہ کر کے صحت یاب ہوتا ہے تو وہ ظاہر پرستی ترک کر دیتا ہے۔ جب کہ بدر منیر بتاتی ہے کہ اس واقعے کے بعد اس کا پہلے واحد متکلّم کے لیے جی کڑھتا ہے، پھر ترس آتا ہے پھر ہمدردی، اُنس اور محبت پیدا ہوتی ہے جو بالآخر عشق میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ یہ صورتِ حال بدر منیر کے لیے کرب کا باعث ہوتی ہے کیوں کہ رشی کے مطابق اُس کا مالک کوئی اور ہوتا ہے اور وہ ''واحد متکلّم'' کے لیے بے تاب ہوتی ہے۔

جب نور جہاں کی ملاقات واحد متکلّم سے ہوتی ہے تو وہ چمیلی نکلتی ہے۔ چمیلی اس کی بچپن کی دوست ہوتی ہے۔ اُس میں وہی سادگی موجود ہے جو بچپن میں تھی۔ عالمانہ اور عاملانہ صفات کی حامل ہے۔ کمرے میں لکڑی کی چوکی ہے جس پر مصلّی بچھا ہوا ہے۔ چاروں طرف الماریوں میں کتابیں

بجی ہوئی ہیں۔ حافظِ قرآن، مصری لہجے میں قرأت کرتی ہے۔ صوم وصلات کی پابند، تہجد، اشراق، چاشت، اوابین، کثرت نوافل، ذکرو شغل اور ریاضت ومجاہدے کی شوقین ہے۔

جب تمام ازواج سے ملاقات ہو جاتی ہے تو پھر ایک دربار سجایا جاتا ہے۔ جس میں حسن و عشق کی بارش ہو رہی ہے۔ ہر جگہ حسن کے جلوے ہیں جو عرش وفرش پر ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں۔ بلقیس کے ہاتھ تھامے ہوئے واحد متکلم، شاہ جہاں، بدر منیر اور نور جہاں کے ساتھ دربار میں داخل ہوتا ہے۔ واحد متکلم روزِ ازل اس میں رکھی گئی صفت کے سبب حسن کا مشاہدہ کرتا ہے۔ کانوں کے ذریعے موسیقیت اس مشاہدے میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ اس دربار میں اچھی صورتیں، پیارے گلے، دل کو کھینچنے والی سریلی آوازیں، دلی کش اور مست کرنے والے ساز، مضامینِ توحید سے لبریز غزلیں، ذوق وشوق میں ڈوبا ہوا نعتیہ کلام ہے۔ دل خوش کن دعائیہ اور تبرکی گیت ہیں۔ چند پھڑکتی ہوئی ٹھمریاں اور ٹپے ہیں۔

ناول کا آخری باب جو کلائمکس ہے۔ اس میں واحد متکلم اقرار کرتا ہے کہ مجھ پر یہ احسان کیا گیا کہ میرا مسکن بمبئی کی مبتذل ہوا سے نکال کر مالابار ہلس کی بلندیوں پر پر لطف، پُر لطیف، پاکیزہ اور فرحت بخش منزل پر بنا دیا گیا۔ سارا جہاں میری خدمت پر مامور رہا۔ اب وہ اس خدمت سے سبک دوش ہو گیا۔ تجربے نے بتا دیا کہ جمال وجلال میری منزل نہیں۔ میرا دل اب کھلونوں سے نہیں بہلتا۔ تُو اپنے کرم سے مجھے اپنی اصلی منزل پر پہنچا دے۔ اصل منزل جو حجابات میں پنہاں ہے۔ اب تُو تمام حجابات کو ہٹا دے۔ مَیں تیری مدد کا محتاج ہوں۔ ملک وملّت، قوانینِ مختلفہ، رسم ورواج، عادات وخصائل، نفس، عقل، وہم اور تخیّلات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوں۔ انھیں توڑ کر اس مقام پر پہنچا دے جہاں کسی فرشتے کا گزر نہ ہوا ہو۔

یہ تھے "بادہ وساغر" کی کہانی کے کچھ اجزا اور کردار، جو اپنے اندر مجازی وعلامتی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ ناول کا صحیح لطف اور ادراک اِسے مکمل اور بار بار مطالعے کے بعد ہی ہوگا۔

ایک اچھے ناول میں دو خوبیاں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک کہانی پن اور دوسرا تجسّس۔ یہ دونوں پہلو "بادہ وساغر" میں نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ ناول کے آغاز بمبئی کے حسین وجمیل

نظاروں سے ہوتا ہے اور مرکزی کردار کے بعد بتدریج کردار ناول میں وارد ہوتے رہتے ہیں اور کہانی کی بنت ہوتی رہتی ہے۔ تجسّس جو کہانی کا حسن ہے، وہ بھی ناول میں برقرار رہتا ہے۔ البتہ اس کی شدّت میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ بعض مواقع پر تو یہ فنّی معراج کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ ناول کے آغاز میں جب سندر واحد متکلّم سے دوسری ملاقات کا وعدہ کر کے جاتا ہے اور وہ اس کے انتظار میں بے کل ہو رہا ہوتا ہے تو ناول نگار نے اپنے بیان سے اس انتظاری کیفیت میں آتشِ اضطراب بھر دی ہے، جس سے قاری بھی اگلے لمحات کا منتظر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح دوسری ملاقات میں جب سندر (شاہ جہاں) واحد متکلّم سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ

> ''مَیں جانتا ہوں کس کے سامنے ہوں۔ آپ سے عرصے سے واقف ہوں، گو آپ مجھ سے واقف نہیں۔ نہ فی الحال آپ مجھ سے واقف ہو سکتے ہیں۔ باہمی روشناسی کا ابھی وقت نہیں آیا۔ . . . مَیں آپ کی زندگی کے ذرّے ذرّے حالات سے باخبر ہوں۔ مَیں اور میرا ایک رفیق اس معاملے میں ہم راز ہیں۔'' (۲۴)

دو اجنبی افراد کی دوسری ہی باہمی ملاقات میں ایک کی طرف سے دوسرے کے لیے واقفیت کے ایسے دعوے قاری میں دل چسپی پیدا کر دیتے ہیں۔ ایک اور موقع پر جب سندر ''واحد متکلّم'' کو اپنی بیوی بلقیس سے ملاقات کا کہتا ہے تو ''واحد متکلّم'' کے بیوی سے متعلق سوالات، کہانی کو آگے بڑھانے کے ساتھ ساتھ دل چسپی پیدا کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ اسی طرح جب بلقیس مرکزی کردار ''واحد متکلّم'' کو بیک وقت چار نکاح کی خبر دیتی ہے تو قاری اس نئی صورتِ حال سے جلد از جلد آگاہ ہونا چاہتا ہے۔ ناول میں کہانی پن اور دل چسپی کا عنصر کسی نہ کسی طور آخری دو ابواب سے قبل تک رہتا ہے۔

خانقاہی ادب کے پہلے اردو ناول ''بادہ ساغر'' کا بنیادی موضوع تصوّف ہی ہے مگر اِسے مجاز کے رنگ میں پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ جس میں ذوقی شاہؒ بڑی حد تک کام یاب ہوئے ہیں۔ اگرچہ پورا ناول ہی تصوف کے رنگ میں رنگا ہوا ہے مگر مشت از خروارے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

ناول کا مرکزی کردار جب سندر (شاہ جہاں) کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے تو اس کی جو اضطرابی کیفیت بیان کی ہے۔وہ حالت ہر اُس مسافر کی ہوتی ہے جو راہِ سلوک پر گام زن ہوتا ہے۔وجہ اس کی یہ ہے کہ جب انسان اپنے اوپر چڑھے غفلت اور مادّیت پرستی کے غلاف میں رحمتِ ایزدی، فیضانِ نظر اور ریاضتوں سے نورِ حقیقت کے لیے روزن نکالتا ہے اور ان روزنوں سے نور کی حقیقی کرنیں انسان کے قلب میں خراماں خراماں داخل ہوتی ہیں تو اُس مسافر میں یہ امنگ پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ نورانی پھوار جلد از جلد موسلا دھار بارش کا روپ دھار لے اور جلد از جلد یہ غفلت اور مادہ پرستی کا غلاف معدوم ہو جائے اور معرفت وحقیقت کی روشنی قلب سے تاریکی کو یک بیک کافور کر دے۔ناول میں اس اضطرابی حالت کی جھلک دیکھیے:

> ''الٰہی! یہ کس آفت کا سامنا ہے۔کس بلا میں گرفتار ہو رہا ہوں۔کس جرم کی سزا میں میرے قتل کا سامان ہو رہا ہے۔ . . . حُسن کے بہت سے نمونے دیکھے۔قیامتیں کئی بار ٹوٹیں،قرب وبعد کی لذّتیں اور تلخیاں چکھیں۔ ۔۔۔گھائل ہُوا بھی اور گھائل کیا بھی۔مگر اس وقت کی سی حالت کبھی نہیں گزری۔''(۲۵)

بمبئی کی پُر رونق زندگی کا تذکرہ کر کے لکھتے ہیں کہ ان سے محسوس ہوتا ہے کہ یہاں تفکّر اور پریشانی کا سایہ تک نہیں ہوگا۔''مگر کان کھول کر سُن رکھو۔یہ سب دھوکا ہے اور مسحور نگاہ کی نظر فریبی۔مادّہ پرست دنیا کی مادّ پرست ہستیاں کبھی سکون واطمینان کی زندگی بسر نہیں کر سکتیں۔''(۲۶) ناول میں تصوف کا واضح اظہار بھی کئی مقام پر نظر آتا ہے۔جب پہلی مرتبہ سندر (شاہ جہاں) اپنی آواز کا جادو جگاتا ہے تو جامیؒ کی عشق میں رنگی ہوئی نعت اور خواجہ غریب نوازؒ کی منقبت ہارمونیم اور طبلے پر پیش کرتا ہے۔(۲۷)

یہاں یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ علمائے ظواہر موسیقی سے اختلاف رکھتے ہیں مگر صوفیۂ کرام کے ہاں اسے شرائط کے ساتھ جائز رکھا گیا ہے۔صوفیۂ کرام اپنی کتب میں موسیقی کے حق میں تفصیلی مباحث ضبطِ تحریر میں لائے ہیں۔ان میں سے کچھ کا تعلق سماع کے انسانی قلب پر

ہونے والے اثرات سے ہے۔ نظام الدّین اولیاؒ نے فرمایا ہے کہ ”سماع قلب (دل) کی تحریک ہے اگر یہ تحریک حق کی یاد میں ہو تو مستحب ہے اور اگر یہ فساد کی طرف مائل ہو تو حرام ہے۔ (۲۸)
جب کہ نظام الدّین اولیاؒ ہی کے حوالے سے ظہیر احمد صدیقی نے سماع کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔ ” حلال، حرام، مکروہ، مباح۔ اگر سماع سننے والے کی رغبت حق کی طرف ہے تو سماع مباح یعنی جائز ہے اور اگر رغبت مجاز کی طرف ہے تو سماع مکروہ ہے اور اگر رغبت کلّی طور پر حق کی طرف ہے تو سماع حلال ہے اور اگر رغبت کلّی طور پر مجاز کی طرف ہے تو سماع حرام ہے۔“ (۲۹)
تصوّف میں ظاہر کی نسبت باطن کو اہمیت دی جاتی ہے بلکہ باطن ہی کو حقیقت تسلیم کیا جاتا ہے البتہ ظاہر باطن تک رسائی میں معاون ہوتا ہے۔ ناول میں مرکزی کردار ”واحد متکلّم“ جب سندر پر عاشق ہونے کا دعوا کرتا ہے تو سندر اُس سے عشق ہونے کی وجوہ معلوم کرتا ہے۔ وہ سوالات کچھ اس طرح کے ہیں:

> ”کیا میرے گانے پر آپ عاشق ہو گئے؟“ ”یہ فرمایئے کہ میری صورت پر عاشق ہیں؟ فرمایئے میری صورت میں کون سی شے پسند آئی؟ میرے لانبے بال؟ یا بے ریش چہرہ؟“ (۳۰)
>
> چہرے پر جھریاں پڑ جائیں گی۔ کمر خمیدہ ہو جائے گی۔ بال سپید ہو جائیں گے۔ مُنڈیا ہلنے لگے گی۔ میری صورت مکروہ ہو گئی تو پھر آپ کا عشق کس راگ میں دُھرپت الاپے گا؟“ (۳۱)

ان سوالات کے جوابات میں ”واحد متکلّم“ عشق پر ایک تقریر کرتا ہے۔ اس کے کچھ ٹکڑوں سے تصوّف کی طرف دھیان جاتا ہے۔ دیکھیے:

> ”جنابِ بندہ! عشق جب ہوتا ہے باطنی رعنائی کے ساتھ ہوتا ہے۔ ظاہری رعنائی وہاں تک رسائی کا ذریعہ ہوتی ہے۔ . . . عشق باطنی رعنائی سے ہوتا ہے۔ جب باطن ہی نہیں ہوگا تو باطنی رعنائی کہاں سے آئے گی اور انسان کا باطن وہ روحِ ملکوتی ہے جو کالبدِ خاکی میں انّی جاعل فی الارض

خلیفتہ کے ساز کی ہم آہنگی میں پھونکی گئی۔" (۳۲)

تصوّف پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ترکِ دنیا کی تعلیم دیتا ہے۔ اس حوالے سے "فواد الفواد" میں نظام الدّین اولیاؒ کے یہ الفاظ سنہری حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> "ترکِ دنیا یہ نہیں ہے کہ کوئی اپنے آپ کو ننگا کرلے۔ مثلاً لنگوٹی باندھ کر بیٹھ جائے۔ ترکِ دنیا یہ ہے کہ لباس پہنے اور کھانا کھائے۔ البتہ جو کچھ آئے اسے خرچ کرتا رہے۔ جمع نہ کرے اور اس سے رغبت نہ رکھے اور دل کو کسی چیز سے اٹکائے نہ رکھے۔" (۳۳)

اس ناول میں ایک موقع پر جب شاہ جہاں (سندر) اور بلقیس کے والد یعنی وزیر اور راجا رشی کی حقیقتِ دنیا کے بارے میں تقریر سن کر اپنی اولاد ہونے کی خواہش واپس لیتے ہیں اور راج پاٹ چھوڑ کر جنگل کی راہ لینے کا کہتے ہیں تو رشی اُن سے کہتا ہے کہ:

> "خدا کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ تم انسانیت سے خارج ہو کر ترقّی کرو بلکہ اس نے تمھیں اس دنیا میں اس لیے بھیجا کہ انسانیت کے دائرے میں رہ کر اس کے حسب، مرضی ترقی کرو۔ صحیح اور اصلی ترقی وہی ہے جو خدا کے مقرر کردہ پروگرام کے مطابق ہو۔ . . . دل کو دنیا سے بے تعلق کرلینا ہی ترکِ دنیا ہے اور اسی کو دل کی پاکی اور صفائی کہتے ہیں۔" (۳۴)

صوفیانہ تعلیمات میں انسانیت اور مخلوقِ خدا سے اچھا برتاؤ بھی خاص درجہ رکھتا ہے۔ ناول میں رشی کی زبان سے مذہب سے بالاتر ہو کر انسانیت کا درس دیا ہے، رشی کہتا ہے: "مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں کہ تم عیسائی، ہو یا یہودی، ہندو ہو یا مسلمان۔ تم سب ایک ہی کشتی پر سوار ہو، تمھاری کشتی کے پیندے میں ایک نہیں بلکہ کئی سوراخ ہو گئے ہیں، جن میں سے ہلاکت کا پانی اندر آ رہا ہے اور تمھاری بربادی کا سامان تمھاری غفلت سے مہیا ہو رہا ہے۔" (۳۵) انسانیت کے حوالے کئی اور مقامات پر بھی نظر آتے ہیں، کیوں کہ صوفیانہ مزاج میں محبت کو فوقیت دی جاتی ہے، یہ جذبہ نوعِ انسانی کو خدا کا کنبہ سمجھتا ہے۔ جب یہ عشق کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے تو

دیگر مخلوقِ خدا پر بھی جن میں چرند و پرند حشرات الارض اور درندوں سے بھی ہم دردی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔تصوّف پیغامِ محبت ہے، جسے دور تک پھیلانا، اس کا مقصد ہے۔

''بادہ وساغر'' میں تصوّف کے علاوہ کچھ ضمنی موضوعات بھی زیرِ بحث آئے ہیں۔ان کا تعلق انگریزداں طبقے اور اہلِ یورپ سے ہے۔کیوں کہ ناول نگار خود بھی انگریزی تعلیم یافتہ تھے۔اس لیے یورپ اور یورپ پسند افراد کی نفسیات سے آگہی رکھتے تھے۔جس کی جھلکیاں ناول میں دکھائی ہیں۔اہلِ یورپ کی جانب سے اسلام میں چار شادیوں پر اعتراض کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ بیوی سے عشق ہونے کو نکاح کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔(۳۶) اس اعتراض کے جواب میں ناول نگار لکھتے ہیں کہ عشق کوئی بازاری چیز نہیں جسے ہر طالبِ نکاح، بوقت ضرورت خرید لیا کرے۔(۳۷) ''عشق نام ہے محبت کی انتہائی ڈگر کا اور مسلمانوں کو جتلا دیا گیا ہے کہ جب تک وہ دنیا و مافی ہا حتّا کہ والدین اور اولاد، خود اپنے آپ تک کی محبت کو خدا و رسول کی محبت میں فنا نہ کر دیں، مومن نہیں ہو سکتے۔''(۳۸)

اسی طرح جب ناول کے مرکزی کردار ''واحد متکلّم'' کو بنارس میں بنا اجازت غلط نیت سے بدر منیر کے کمرے میں جانے کے سبب جس بزرگ نے ڈانٹا اور تھپڑ رسید کر کے کمرے سے بھگایا تھا۔اس واقعے کی توجیہ شاہ جہاں، بلقیس اور بدر منیر نے نہیں کی تو ''واحد متکلّم'' نے تصوّر کیا کہ:

> ''یہ عورتیں کس قدر زیرک وفہیم ہیں، انھوں نے خیال کیا ہوگا کہ یہ انگریزی پڑھے لکھے لوگ ایسی باتوں کے قائل نہیں ہوتے۔''(۳۹)

مذکورہ تصوّر آج بھی لوگوں کے ذہن میں مرتسم ہے کہ بیش تر پڑھے لکھے افراد عموماً روحانیت اور محیّر العقول واقعات پر یقین نہیں رکھتے۔جب تک کہ خود ان کے ساتھ کوئی بہت ہی واضح اور پُر اثر واقعہ نہیں بیتے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ روحانیت ایک عملی طرزِ حیات ہے۔اس کا مشاہدہ اور تجربہ صرف اُن ہی لوگوں کو ہوتا ہے جو عملی طور پر روحانیت میں داخل ہوتے ہیں اور اسے اپنی توجّہ کا مرکز بناتے ہیں۔تصوّف کی کتابوں کا مطالعہ اور بحث و مباحثہ کرنے والے افراد اس کی حقیقت سے واقف نہیں ہو سکتے۔اس لیے وہ اپنی عقل اور فکر کے مطابق ایسے واقعات پر اعتراضات کرتے ہیں۔

ایک اور موقع پر انگریزی تعلیم کے بارے میں اس وقت اظہار کیا گیا ہے جب شاہ جہان (سندر) کو مصلحتاً اداکاری کرائی جاتی ہے تو اس پر اعتراضات ہوتے ہیں تو شاہ جہاں کا والد یعنی وزیران کے جواب میں کہتا ہے کہ:

> ''لڑکے کا یہ شوق انگریزی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ انگریزی مذاق ایکٹنگ کو مبتذل نہیں قرار دیتا۔'' (صفحہ نمبر ۱۱۰) ''وہ [یورپ کے] لوگ عموماً مادّہ پرست ہیں۔ . . . یورپ والوں کا خیال ہے کہ نقالی سے لڑکا ذہین ہوتا ہے۔ چاق چوبند ہوتا ہے۔ . . . ہندوستان بھی یورپ کے خیالات سے متاثر ہو رہا ہے۔'' (۴۰)

ناول میں کردار نگاری کا فن بھی نظر آتا ہے، یوں تو تمام کردار محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں، مگر ان کی پیش کش میں بہت معمولی سا فرق محسوس ہوتا ہے۔ سندر (شاہ جہاں) کا کردار بھرپور ہے۔ ناول نگار نے ان کی صفات اور تعارف بھی دیا ہے، جس کے ذریعے ہمیں ان کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں مگر ان کے عملی مظاہرے بہت ہی کم دکھائی دیتے ہیں۔ بدر منیر کے کردار کو دیکھیے ''انھیں ہوا خوری کا شوق نہیں، نہ تھیٹر دیکھنا پسند کرتی ہیں۔ اسٹیج پر حسن و عشق کا ڈراما؛ اس کی کیفیات میں ناقابلِ برداشت شورش کا باعث ہوتا ہے۔ اس لیے وہ تماشے بننے سے گریز کرتی ہیں۔ بالطبع تنہائی کی صحبتیں ان کی نہایت دل چسپ اور پُر کیف ہوتی ہیں۔ شعر و شاعری میں خاصا دخل ہے، علاوہ اس کے کہ اساتذہ کا چیدہ چیدہ کلام بہت کچھ یاد ہے، خود بھی نہایت پھڑکتے ہوئے شعر کہتی ہیں، شعر پڑھنے کا انداز نہایت بانکا اور موثر ہے۔ شعلہ تخلص فرماتی ہیں۔'' (۴۱) اس طرح دیگر کرداروں کے بھی مختصر تعارف کرائے گئے ہیں، جن میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مختلف صوفیانہ مزاج کے حامل افراد کی تصویر کشی کی گئی ہو۔ ناول میں ایک کردار ہَوس پرست کا بھی ہے، جو خانقہی رنگ چڑھا کر اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کر رہا ہے۔ ''واحد متکلم'' کے دوست ہیں، یہ بڑا جان دار کردار ہے جو انتہائی کم وقت کے لیے ناول میں وارد ہوتا ہے اور مگر اپنا تاثر چھوڑ جاتا ہے، جب انھیں ''واحد متکلم'' کے کاروبار بند کرنے کی اطلاع ملتی ہے، تو وہ سمجھانے کے لیے دوڑے ہوئے آتے ہیں

مگر جب جواب میں یہ سنتے ہیں کہ "ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں" تو بڑے سخت رَدِّ عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

"مجھ سوختۂ عشق پامال محبت سے یہ شخص کہتا ہے کہ "ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں" مَیں۔ ۔ ۔ مَیں نے۔ ۔ ۔ مَیں نے پی ہی نہیں، مَیں اتنے اچھے شعر کہتا ہوں کہ ان کے سمجھنے اور داد دینے والے اس زمانے میں میسّر نہیں۔ دیوانِ حافظ کی اتنی اچھی شرح کرتا ہوں کہ آج تک کسی نے نہیں کی، ڈراما نویسی میں اچھوں اچھوں کے چھکّے چھڑا دیے، فلسفۂ حسن وعشق پر اتنا اچّھا لیکچر دیتا ہوں کہ بمبئی کی تعلیم یافتہ خواتین میرا لوہا مانتی ہیں اور یہ شخص مجھ سے کہتا ہے کہ ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں۔" (۴۲)

اس کردار کا تعارف بھی بہت دل چسپ کرایا گیا ہے۔ بڑے عاشق مزاج ہیں، فوراً عاشق ہو جاتے اور یہ سمجھتے کہ مقامِ معشوقیت عطا ہوا ہے، جس عجلت سے عشق فرماتے، اسی طرح لوٹتے، دو چار نہیں، دس پانچ نہیں بلکہ سیکڑوں واقعات ہو چکے، ہمّت اتنی بلند کہ ایک ایک دن میں تین تین عشق نبٹائے، صبح سے دوپہر تک ایک، دوپہر سے شام تک دوسرے اور شام سے صبح تک اور کبھی سوتے وقت تک تیسری مہم سر کر لی۔ آدمی نہایت معقول ہیں۔ (۴۳)

"بادہ وساغر" جہاں دنیائے تصوّف کا پہلا اردو ناول ہے وہیں اس کی انفرادیت اسلوبِ بیان کی وجہ سے بھی ہے۔ اس اسلوب کے ذریعے اردو فکشن بالخصوص ناول میں استعاراتی اور علامتی اسلوب کی کڑیاں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ غالب گمان ہے کہ اردو ناول نگاری میں علامتی اور اشاراتی بیان کی ابتدا اسی ناول سے ہوئی ہے۔ کیوں کہ اس سے قبل اردو ناول کی تاریخ میں سجاد ظہیر کے ناولٹ "لندن کی ایک رات" میں عمومی علامتی رنگ کا کھوج لگانے کی کاوش نظر آتی ہے۔ (۴۴) یہ ناولٹ ۱۹۳۸ء میں لکھا گیا، جب کہ "بادہ وساغر" ۱۹۲۰ء میں لکھا گیا۔ اردو ناولوں میں اب بھی علامتی رجحان کوئی خاص فروغ نہیں پا سکا۔

یہ بات تو اپنی جگہ درست ہے کہ ذوقی شاہؒ کے افسانہ اور ناول نگاری شعبے نہیں تھے۔ اس

کے باوجود علامتی اسلوب پر ان کے اس تجربے کو ایک کامیاب تجربہ کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ انھوں نے پیش کردہ علامتوں کو کامل علامتیں نہیں رہنے دیا، بلکہ موقع کی مناسبت سے کچھ اشارے بھی دیتے رہے۔ یہ بات درست ہے کہ علامت میں وضاحت ضروری نہیں ہوتی۔ لیکن جس دور میں یہ تجربہ کیا گیا۔ اس کے پیشِ نظر اس قسم کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی پورے ناول پر علامتی رنگ کو منطبق کرنا آسان نہیں ہے۔ علامتی اسلوب کی مثالیں ملاحظہ کیجیے۔ ''واحد متکلّم''، بلقیس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

> ''ابتداً مقصود تک پہنچنے کا ذریعہ ہی مطلوب ہوتا ہے۔ وسیلے ہی سے سابقہ پڑتا ہے۔ اسی سے ربط رہتا ہے۔ اسی میں انہماک حاصل ہوتا ہے۔ تب کہیں مقصودِ اصلی تک رسائی ہوتی ہے۔ تمھارا وجود اس وقت میرے لیے بمنزلہ کشتی کے ہے۔ جس میں بیٹھا ہُوا اپنی منزل طے کر رہا ہوں۔ تم مجھے میرے جدید شوق، میری مستقل راحت اور میرے مقصدِ زندگی کی جانب لے جا رہی ہو۔'' (۴۵)

مذکورہ بالا اقتباس سے تصوّف اور سلاسل کی تعلیم سے وابستہ فرد بہ آسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ معاملات شیخ اور مرید کے ہوتے ہیں۔ بلقیس کے سپرد کرنے والا شاہ جہاں ہے۔ شیخ کا حصول کس کے کرم کا نتیجہ ہوتا ہے؟ شاہ جہاں کو ''واحد متکلّم'' کس حالت میں ملتا ہے؟ اُس حالت کے آنے میں کس کا کردار ہے؟ یہ سب باتیں ناول میں ہیں۔ نور جہاں کی صفات بھی قابلِ غور ہیں۔ جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

ایک اور موقع پر جب ناول اپنے اختتام کے قریب ہوتا ہے تو ''واحد متکلّم'' اپنی چاروں بیویوں کا مختصر تعارف اس انداز میں کراتا ہے۔

> ''بدرِ منیر میں جلال کی شان غالب، اس جلال میں جمال کی ٹھنڈی شعاعیں نمودار۔ بلقیس میں جمال کی شان غالب مگر اس جمال کی تہ میں انتہا درجے کا جلال پوشیدہ۔ شاہ جہاں میں جلال و جمال دونوں کا ظہور مگر

ایک نسبت مختص۔ایک نسبت راز و نیاز کی چادر میں لپٹا ہوا اور مجھی
پر،صرف مجھی پر متجلی۔نور جہاں میں عبدیت کی شان کا غلبہ۔سب کچھ پھر
کچھ نہیں۔کچھ نہیں مگر سب کچھ۔ان جملہ کیفیات میں سے ایک بھی
کیفیت ایسی نہیں جو خالی از لطف ہو۔"(۴۶)

اس علامتی اسلوب کی تفہیم کے لیے ناول کا دیباچہ بھی رہ نمائی دیتا ہے۔جس میں "واحد متکلم" کی کہانی اور شاہ جہاں کے کردار پر روشنی ڈال کر دیگر کرداروں کی کھوج سے منع کیا گیا ہے۔ ناول کے حسن اور معنویت کو واضح کرنے کے لیے بڑی تعداد میں فارسی اور اردو اشعار دیے ہیں۔جن سے قاری محظوظ ہوتا ہے مگر یہ اسلوب عمومی طور پر ناول کے اسلوب سے لگا نہیں کھاتا۔" بادہ وساغر" لکھنے کا مقصد کسی فن پارے کی تخلیق نہیں ہے بلکہ مجاز کے پردے میں حقیقت کی پردہ کشی ہے۔صراطِ مستقیم پر گام زن کرنے کی سعی ہے۔اِس لیے معرفت کے رنگ میں رنگے ہوئے اور دیگر اشعار موضوع کی تفہیم میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔ناول نگار کا اصل مدعا بھی یہی ہے کہ قاری اس کو پڑھ کر اُس راہ کے مسافر ہو جائیں،جس کی منزل تک فرشتوں کی رسائی نہیں ہے۔اس اسلوب سے ناول کی فنی حیثیت تو کچھ متاثر ہوئی،مگر ناول کی علمی اور ادبی وقعت میں اضافہ ہُوا ہے۔

✿ ✿ ✿

حوالے

(۱) ''خانقاہی ادب سے مراد وہ متصوفانہ تحریریں ہیں، جن کے لکھنے والے خانقاہی نظام سے وابستہ ہوں، یعنی مشائخ اور ان کے مریدین کی تحریریں۔ جب کہ خانقاہی نظام سے غیر وابستہ افراد کی متصوفانہ موضوعات پر تحریریں تصوّفانہ ادب کہلاسکتی ہیں۔ تصوفانہ یا متصوفانہ ادب سے مُراد وہ تحریر ہوتی ہے، جس میں تصوّف سے متعلق موضوعات کو بیان کیا جاتا ہے۔''

(ذوالفقار علی دانش: ''خانقاہی ادب کی سماجی اہمیت'' مشمولہ ''الماس'' شارہ ۱۴، مدیر: ڈاکٹر محمو یوسف خشک: خیر پور، شعبۂ اردو، شاہ عبداللّطیف یونی ورسٹی۔ مارچ ۲۰۱۲ء، ص ۳۶۰، ۳۶۱۔)

(۲) قمر رئیس، ڈاکٹر: ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار''علی گڑھ، سرسید بک ڈپو، باردوم، ۱۹۶۴ء، صفحہ ۳۶۱۔

(۳) ذوقی: ''بادہ وساغر'' کتبۂ حامد، وارث حسنی، ۱۹۵۵ء، صفحہ ہ

(۴) ذوقی: ''بادہ وساغر''، صفحہ و۔

(۵) ذوقی، سید شاہ محمد: ''تربیۃ العشاق'' کراچی، محفلِ ذوقیہ، اشاعتِ ششم ۲۰۰۷ء، ص ۸۰۔

(۶) ذوقی: ''بادہ وساغر''، صفحہ و۔

(۷) عشرت حسین سید: ''حیاتِ اکبر''، کراچی، بزم اکبر، سنہ ندارد، ص ۱۲۹، ۱۳۰۔

(۸) جمیل جالبی، ڈاکٹر: ''تاریخِ ادبِ اردو''، جلد چہارم، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، اشاعت اوّل ۲۰۱۲ء، ص ۷۵۹۔

(۹) طالب الہ آبادی: ''اکبر الہ آبادی''، الہ آباد، مطبع انوار احمدی، اشاعت اوّل، سنہ ندارد، ص ۳۲۔

(۱۰) طالب الہ آبادی: ''اکبر الہ آبادی''، الہ آباد، مطبع انوار احمدی، اشاعت اوّل، سنہ ندارد، ص ۴۶۷۔

(۱۱) آل عمران، ۳: ۱۸۵۔

(۱۲) ذوقیؒ ''بادہ وساغر''، ص ۴۔

(۱۳) ذوقیؒ ''بادہ وساغر''، ص ۲۵۲۔

(۱۴) ایضاً۔

(۱۵) ایضاً۔

(۱۶) ایضاً۔

(۱۷) ایضاً، ص ۲۵۱۔

(۱۸) ایضاً، ص ۲۶۲۔

(۱۹) ایضاً، ص ۲۵۰۔

(۲۰) ایضاً، ص ۲۵۰۔

(۲۱) ایضاً، ص ۲۵۰۔۲۵۱۔

(۲۲) شریف الحسن، سید: ''سیرتِ ذوقی''، مشمولہ ذوقی، سید شاہ محمد: ''تربیۃ العشاق'' کراچی، محفلِ ذوقیہ، اشاعتِ ششم ۲۰۰۷ء، ص ۴۲۹ تا ۵۰۴۔

(۲۳) ذوقیؒ ''بادہ وساغر''، ص ۳۴۔۳۵

(۲۴) ایضاً، ص ۲۰۔

(۲۵) ایضاً، ص ۶، ۷۔

(۲۶) ایضاً، ص ۳، ۴۔

(۲۷) ایضاً، صفحہ نمبر ۴۱۔

(۲۸) نظام الدین اولیا: ''فوائد الفواد''، جمع کردہ: امیر حسن، مترجم: حسن ثانی نظامی، لاہور، الفیصل ناشران، ۲۰۰۸ء، ص ۵۴۰۔۵۴۱۔

(۲۹) ظہیر احمد صدیقی: ''سماع و موسیقی تصوّف میں''، لاہور، تخلیقات، ۲۰۱۰ء، ص ۸۱، ۸۲۔

(۳۰) ذوقیؒ ''بادہ وساغر''، صفحہ ۵۲۔

(۳۱) ایضاً، ص ۵۳۔

(۳۲) ایضاً، ص ۵۳، ۵۴۔

(۳۳) نظام الدین اولیا: ''فوائد الفواد''، ص ۱۶۴۔

(۳۴) ذوقیؒ ''بادہ وساغر''، ص ۸۵۔

(۳۵) ایضاً، ص ۷۵۔

(۳۶) ایضاً، ص ۱۲۹۔

(۳۷) ایضاً، ص ۱۳۰۔

(۳۸) ایضاً، ص ۱۳۱۔

(۳۹) ایضاً، ص ۱۹۴۔

(۴۰) ایضاً، ص ۱۱۱۔

(۴۱) ایضاً، ص ۲۰۱، ۲۰۲۔

(۴۲) ایضاً، ص ۲۰۵۔

(۴۳) ایضاً، ص ۲۰۳۔

(۴۴) قمر رئیس، پروفیسر: "اردو میں بیسویں صدی کا افسانوی ادب"، دہلی کتابی دنیا، ۲۰۰۴ء، ص ۳۰۲، ۳۰۳۔

(۴۵) ذوقؔ "بادہ وساغر"، صفحہ نمبر ۱۶۳۔

(۴۶) ایضاً، ص ۲۲۳۔

✿ ✿ ✿

تعارف

ہر کسے بادہ کشے طالبِ جام است ایں جا
ہر کہ بسیار کشد مرد تمام است این جا
کاشفی خواست کہ تا توبہ کند پیرِ مغاں
گفت خاموش ز مے توبہ حرام است ایں جا

(ہر مے نوش یہاں جام کا طالب ہے یہاں بسیار خور ہی مرد کہلاتا ہے۔ کاشفی نے چاہا کہ پیر مغان توبہ کر لے، اُس نے کہا یہاں توبہ کرنا حرام ہے۔)

ساغرِ عرفاں کے سرشاروں اور سحابِ بادۂ معرفت کے چھینٹوں سے سیراب ہونے والوں کے لیے ''بادہ و ساغر'' یعنی خُم خانۂ ذوقی میں دعوتِ بادہ نوشی سے قبل انتہائی ضروری ہے کہ صاحبِ ''بادہ و ساغر'' سے کم از کم مختصر سی ملاقات کا شرف حاصل ہو۔

آپ کا نامِ نامی سید محمد ہے۔ سلسلۂ نسب حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سے ملتا ہے۔ آبائی وطن فرخ آباد، تعلیمِ دینی کے علاوہ علی گڑھ کالج کے ذریعے بی۔اے تک تعلیم حاصل کی۔ مولانا محمد علی جوہر اور سید سجاد حیدر (یلدرم) کے ہم جماعت رہے۔ ایک تو آسمانِ سیاست پر آفتاب بن کر چمکا۔ دوسرے نے میدانِ ادب میں شہرتِ دوام حاصل کی اور موصوف جس دولتِ لازوال کے مالک بنے اس کا اندازہ سطورِ ذیل سے ہو سکتا ہے۔

کالج کا دور ختم کرتے ہی تھوڑے عرصے پولیٹکل ڈپارٹمنٹ میں ملازمت کی۔ اس کے بعد جرنلزم کی طرف مائل ہوئے۔ آج سے تقریباً پچاس سال قبل سندھ کے مشہور انگریزی اخبار ''الحق'' اور پنجاب کے مقبول و مؤقر اخبار ''وکیل'' کو آپ کی ادارت کا فخر حاصل رہا۔ بعد ازاں ایک تاجر کی حیثیت سے بمبئی تشریف لے گئے۔ جہاں آپ نے نہایت کامیابی سے ہارڈ ویئر کی

تجارت کی۔ چوں کہ موصوف وممدوح میں کچھ تو نسبی خون کا اثر اور کچھ ذاتی خلوص کا رنگ موجود تھا یک بارگی آپ کی طبیعت نے پلٹا کھایا اور جذبۂ تلاشِ حق نے کچھ ایسی جنبش لی کہ اپنا چلتا چلاتا کاروبار یک لخت بند کر دیا۔

بادِ صبا زعالم ناگہ نقاب برداشت
کالشمس فی ضحاہا تطلع من الغمامہ

(بادِصبا نے عالم سے اچانک نقاب اُٹھایا۔ جیسے بادلوں میں چھپا ہُوا سورج گھٹاؤں سے نکل آیا ہو۔)

صدق وخلوص کی برکت سے تائیدِ غیبی حاصل ہوئی اور بحمداللہ ایک شیخِ مکمل یعنی حضرت سید شاہ وارث حسن صاحب کوڑہ جہان آبادی کی بارگاہ میں رسائی ہوگئی۔

مے کدۂ وارث حسنی سے آواز آئی، ''کہ بیابیا عراقی تو خاصگانِ مائی'' پھر کیا تھا۔

حافظ چو طالب آمد جامے و جانِ شیریں
حتی یذوق منہ کاساً من الکرامۃ

(حافظ جام اور جانِ شیریں کا طالب ہے تا کہ کرامت کے جام کا ذائقہ چکھ سکے۔)

بادۂ وارث حسنی کی سرمستیاں شروع ہوئیں۔ چشتی، قادری، صابری، نظامی، سہروردی اور نقشبندی بھٹیوں سے کھنچی ہوئی شراب کے خُم کے خُم لُنڈھائے جانے لگے۔ ع
''جوش زدمستی و چشمِ دل براں مے خانہ شد'' لیکن ہاں ضرور ہے کہ

مسعود یک از بادہ چناں مست نہ گشتی
آں جامِ دلآویز تو ساغر نہ شدے گر

(مسعود ایک جام سے اتنا مدہوش نہ ہوتا اگر وہ ترا دل آویز جام، ساغر نہ ہوتا۔)

کیف ومستی کے اس ذوقِ سلیم کے صلے میں ذوقی شاہ کا خطاب عنایت ہُوا۔ اور ۱۹۱۹ء میں مے کدۂ وارث حسنی کے مجاز ومالک قرار دیے گئے اور اب تو اپنی ذاتی کمائی اور اپنے شیخ سے ورثہ پائی ہوئی عرفانی دولت سے مے خانۂ ذوقی کی داغ بیل پڑ گئی اور ایک وقت وہ آیا کہ:

محتسب را مست دیدم درمیانِ مے کدہ
صحن مست و خلق مست و جملگی بازار مست

(میں محتسب کو بھی مے کدے میں مست دیکھ رہا ہوں۔ یہاں صحن اور لوگ ہی مست نہیں بلکہ سارا بازار ہی مست ہے۔)

میرے اس دعوے کی تصدیق نہ صرف پاکستان و ہندوستان سے ہوگی بلکہ یورپ بھی اس کی گواہی دے گا۔ حبیب اللہ لوگرو کی سرمستیوں سے دریافت کیجیے کہ اس نے کس مے خانہ کی دریوزہ گری کی ہے۔ فاروق احمد لینارڈ سے پوچھیے جو فروری ۱۹۴۳ء سے حضرت داتا گنج بخشؒ کے دامنِ رحمت میں راحت گزیں ہے۔ عزیز دلم شہید اللہ لینارڈ زاد عمرہٗ و عم فیضہٗ سے معلوم کیجیے جسے خود ذوقی نے اپنے مے کدے کا متولی بنادیا ہے۔ ع

"بہ حیرتم کہ عجب تیرِ بے کماں زدہ"

(حیران ہوں اس کمال پر کہ تیر کمان بغیر کمان کے چل رہا ہے۔)

اور موصوف نے نہایت ہی آن بان کے ساتھ اس مے خانہ کا انتظام قائم رکھا ہے اور آج بھی جس کی نظر اس مے خانۂ معرفت پر پڑ جاتی ہے وہ یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ ؎

کیست دُردے کشِ ایں مے کدہ یارب کہ درش
قبلۂ حاجت و محرابِ دعا می بینم

تعارف ادھورا رہ جائے گا اگر شاہ صاحب کے صرف اسی شاہ کار کی جانب اشارہ کر کے اکتفا کروں۔ آپ کو اچنبھا تو نہ ہوگا؟ اگر میں یہ عرض کردوں کہ حضرت ذوقی شاہ صاحب نے سیاسیات ملکی میں کس قدر اہم ترین کارِ نمایاں انجام دیے ہیں۔ آپ اگر معلوم کرنا چاہتے ہیں تو اس کا ثبوت آپ کو اُس خط و کتابت سے حاصل ہوگا جو دورانِ تحریکِ پاکستان قائدِ اعظم اور حضرت ذوقی شاہؒ کے مابین ہوتی رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اراکین "محفلِ ذوقیہ" ان اہم ترین طرفینی مراسلات کو شائع فرما کر کم از کم دنیا والوں پر یہ واضح کردیں کہ صوفیائے متقدمین کی طرح اس دورِ الحاد میں بھی گوشہ نشین اہل اللہ نے کس قدر اہم سیاسی خدمات انجام دی ہیں۔ اہلِ دل تو اس راز سے خوب واقف ہیں کہ صاحبِ ارشاد منتہی صوفی خدمتِ خلق کے لیے مامور من اللہ ہُوا کرتا ہے۔ ان کے لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ حیرت تو انھیں ہوگی جو ان مستانِ خراباتِ

لم یزلی سے نا آشنا ہیں۔ ؎

بس تجربہ کردیم کہ داروئے غمِ دل
چیزیست کہ درخانۂ خمار فروشند

(غمِ دل کی دوا کا تجربہ بہت کر چکے، وہ چیز ہے جو مے خانے میں بیچا کرتے ہیں۔)

علاوہ ازیں اس جامع اوصاف ہستی نے تو علمی، ادبی اور تاریخی خدمات سے بھی ملک وقوم کو سرفراز فرمایا ہے۔ چناں چہ آپ کی تصانیف بطور یادگار آج بھی موجود ہیں۔ مثلاً (۱) سرِّ دلبراں (۲) کتبِ سماوی پر ایک نظر (۳) ''القا، الہام، وحی'' (۴) برزخ (۵) فہم قرآن (۶) ''نیو سرچ لائٹ آن ویدک آرنیز'' (۷) مضامینِ ذوقی (اردو، انگریزی)، (۸) صوفی ازم (انگریزی) وغیرہ۔

جو شان آپ کی حکیمانہ گفتگو میں تھی، وہی چیز آپ موصوف کی تحریرات میں بھی پائیں گے۔ اختلافی مسائل یا دعوت الی اللہ کے موقع پر تقریر ہو یا تحریر شاہ صاحب کو بالکل **آیۂ ادع الٰی سبیلِ ربک بالحکمت والموعظۃِ الحسنہ** کی عملی تفسیر ہی پائیں گے۔

اب اسی ناول کو لیجیے جو آج سے ۳۵ سال قبل کی تصنیف ہے اس میں بھی جو حکمت پوشیدہ ہے۔ اس کا راز اس کے پڑھنے کے بعد آپ کے قلب پر ہویدا ہوگا۔ اِس وقت صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ جب لسان العصر حضرت اکبر الٰہ آبادی نے اس کا مسودہ پڑھا تھا تو یہ فرمایا کہ ''شاہ صاحب آپ نے تو سوڈا واٹر کی بوتل میں آبِ زم زم مِلا دیا ہے۔''

ایک مسلمہ جلیل القدر مبصر کے اس جامع و بلیغ فقرہ داد کے بعد یہ ناول کسی مزید تبصرے کی محتاج نہیں رہتی۔ لہٰذا اب بلا تأمل ڈاٹ کھولیے اور نوشِ جان کیجیے۔

خادم سلسلۂ وارث حسنی
محمد حسین بُرے
(سابق خطیب جامع مسجد بمبئی)

✿ ✿ ✿

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہِ الکریم

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

صبحِ بنارس اور شامِ اودھ کی دلآویزیوں سے ازخودرفتہ ہونے والو! کبھی تم نے بمبئی جاکر شامِ چوپاٹی کے بھی لطف اُٹھائے ہیں۔ اپالو اور بینڈ اسٹینڈ کی گل گشت کے مزے لوٹے ہیں۔ وکٹوریہ گارڈنس کے پھول پتوں سے سرگوشیاں کی ہیں۔ چاندنی رات میں وال کیشور پر جاکر ہینگنگ گارڈنس کی مستیوں کے جھونکے بھی کھائے ہیں، اگر اس کا اتفاق نہیں ہُوا تو جاؤ اور جاکر دیکھو کہ قدرت کی گلکاریوں، انسانی صناعی کی ہم آغوشی میں کیا کیا گل تراشیاں اور کیسی کچھ سحر آفرینیاں کی ہیں، سحر آفرینیاں اسی کو کہتے ہیں کہ ہو کچھ اور نظر آئے کچھ۔ ہو رسّی اور دکھائی دے سانپ، ہو گلٹ اور اصل کا دھوکا ہو۔

بمبئی پر ایک سطحی نظر ڈالو تو دیکھو گے کہ سمندر کے کنارے سمندر آباد ہے۔ پانی کے سمندر میں موجیں خشکی پر لہریں مار رہی ہیں۔ بازاروں کی سیر کرو۔ گلی کوچوں میں چکر لگاؤ۔ دوکانوں اور کارخانوں کو جاکر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ایک عظیم الشّان مشین ہے جس کا ہر پرزہ اپنے کام میں باہوشی سے مصروف ہے۔ جسے دیکھو! اپنی دُھن میں مست۔ جس پر نظر ڈالو اپنی مستی میں مستغرق، جسے ٹٹولو، بظاہر مستغنی، بول اٹھو گے۔

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

(بہشت وہ جگہ ہے جہاں کوئی دکھ نہیں ہوتا، اس لیے کسی کو کسی سے کام نہیں ہوتا۔)

یہاں کی سیر گاہوں، یہاں کے سینما، سرکس اور تھیٹروں میں جا کر دیکھو تو خیال کرو گے کہ تفکرات اور پریشانیوں سے یہاں والوں کو کبھی سابقہ ہی نہیں پڑا۔ایک عام چہل پہل نظر آئے، جس سے دن عید اور رات شبِ برات کا دھوکا ہوگا مگر کان کھول کر سن رکھو کہ یہ سب دھوکا ہے اور مسحور نگاہ کی نظر فریبی۔مادہ پرست ہستیاں کبھی سکون واطمینان کی زندگی بسر نہیں کر سکتیں۔ان کے رہنے کے لیے کیسے ہی عالی شان ایوان ہوں۔ان کے نقل وحرکت کے لیے کیسی خوش نما تیز رو اور آرام دہ سواریاں ہوں۔ان کے نام سے لاکھوں کے وارے نیارے ہی کیوں نہ ہوتے ہوں۔ اطمینان اور چین کی زندگی انھیں نصیب ہونا محال ہے۔سائنس اب تک ایسی ایکس ریز کی ایجاد سے قاصر ہے۔جن سے لوگوں کی قلبی کیفیات کے معائنے میں مدد مل سکے۔اگر ایسی شعاعیں تمھارے قبضے میں ہوتیں تو تم دیکھتے کہ وہ شخص جو ایونس فریزر کے ہاں کا سِلا ہُوا سوٹ پہنے ایک اعلا درجے کے موٹر سے اُتر کر گرینس رسٹران میں بیٹھا ہُوا تمھارے ساتھ مسکرا مسکرا کر تم سے باتیں کر رہا ہے۔اندر سے انتشار واضمحلال کی وہ مہیب صورت بنا ہُوا ہے کہ اس کا ہلکا سا پرتو بھی تم پر پڑ جائے تو مسکراہٹ تمام عمر کے لیے تمھارے لبوں سے رخصت ہو جائے۔

مَیں ان کیفیات سے بہ خوبی واقف ہوں۔مجھ پر یہ گزری ہیں۔مَیں ذاتی تجربہ رکھتا ہوں۔زیادہ نہیں تو ان تلخیوں کا کسی قدر ذائقہ بھی چکھا ہے۔

شام کا وقت تھا۔چوپاٹی اس دن غیر معمولی جوبن پر تھی۔جی بہلانے اور غم غلط کرنے کے خیال سے مَیں بھی وہاں جا نکلا مگر دلِ غم زدہ پر افسردگی کی ایسی کچھ کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی کہ وہ سارا منظر مجھے تاریک معلوم ہُوا۔جی نہ لگا۔وحشت بڑھی اور مَیں اپنے افسردہ دل کو پہلو میں دبائے ،اپنے تخیلات میں ڈوبا ہُوا، سمندر کے کنارے بینڈ اسٹینڈ کے قریب جا نکلا اور ایک تنہا بنچ پر بیٹھ کر اپنے خیالات سے دل ہی دل میں باتیں کرنے لگا۔اپنی زندگی پر ریویو کرتا رہا کہ کیا تھا اور کیا ہوگیا۔خاندان کا خاندان مذہبی تقدس میں ممتاز اور مَیں ایک دنیا دار آزاد، تعلیم وتربیت مجھے دی گئی۔اس خیال سے کہ علمی خدمات کی مجھ میں صلاحیت پیدا ہو مگر مَیں ہوں کہ مشاغلِ علمی کو خیر باد کہہ کر روپیہ سمیٹنے کی ہَوس میں یہاں آکر بنیا بنا ہوا ہوں اور وہ بھی ایک فیشن ایبل بنیا! جو ہم معنی ہے اس کے کہ ضرورت سے زائد بوجھ سر پر رکھ لیا۔پھر بیوی مرحومہ کے انتقال اور دیگر صدمات نے اضمحلال کچھ ایسا پیدا کر دیا تھا کہ روپیہ پیدا کرنے کی امنگیں جن تحریکوں کے باعث عموماً موج زن

ہوتی ہیں۔ وہ یہاں مفقود ہوتی جاتی تھیں۔ کشمکش میں تھا کہ زندگی کی روش میں اب کسی تغیر کا ہونا مناسب ہے یا نہیں کہ قدرت نے یکا یک ایک نیا شگوفہ کھلایا۔

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخم کاری ہے

دیکھتا کیا ہوں کہ حسن کی ایک بولتی ہوئی تصویر آئی اور میرے پہلو میں بیٹھ گئی۔ بنچ کے اس کنارے میں ہوں اور اُس کنارے وہ۔"

آپس میں بات ہے نہ چیت۔ تعارف ہے نہ روشناسی۔ ادھر میں چپ اُدھر وہ خاموش۔ اِدھر میں اپنے خیالات میں الجھا ہوا، ادھر وہ سمندر کے تموج کی جانب ٹکٹکی باندھے ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے سے بے غرض بے تعلق مگر نہ معلوم کیا ہے کہ جسم میں ایک لرزہ سا پیدا ہو گیا۔ بدن میں سنسنی سی ہونے لگی۔ ہزار کوشش کرتا ہوں کہ اپنے تخئیلات سے بدستور باتیں کرتا رہوں مگر دل ہے کہ قابو سے ہُوا جاتا ہے۔

تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانسی سی اک دل میں چبھ گئی
مانا کہ ان کے ہاتھ میں تیر و سناں نہ تھا

الٰہی! یہ کس آفت کا سامنا ہے۔ کس بلا میں گرفتار ہو رہا ہوں۔ کس جرم کی سزا میں میرے قتل کا یہ سامان ہو رہا ہے۔

جو بات ہے ظالم کی نئی ڈھنگ نیا ہے دنیا سے جدا ہے
انداز وہ پائے ہیں کہ جی مان گیا ہے شوخی میں حیا ہے

حسن کے بہت سے نمونے دیکھے، قیامتیں کئی بار ٹوٹیں۔ قرب و بعد کی لذّتیں اور تلخیاں چکھیں، مرنے جینے کے کھیل کھیلے، گھائل ہوا بھی اور گھائل کیا بھی مگر اس وقت کی سی حالت کبھی نہیں گزری۔ یہ بپتا پہلے کبھی نہیں پڑی۔ یہ سماں آنکھوں کے سامنے کبھی نہیں آیا۔

دیکھ کر چشمِ مست جی ڈوبا
غوطے کھائے شراب میں ہم نے

سچ کہتا ہوں کہ حسنِ امرد نے اس سے قبل کبھی مجھ پر قیامت نہ توڑی۔ کبھی ایسا سرشار نہ کیا۔

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

جسم کا کینڈا گجراتی تھا۔لباس بالکل سادہ، سیاہ کوٹ اور واسکٹ، سفید دھوتی اور سیاہ ٹوپی مگر ٹوپی کے نیچے سر پر بالوں کا جوڑا۔انگلی کے پورے اور ہتھیلی میں مہندی، لبوں پر پان کا لاکھا۔یا اللہ! کیا کسی گجراتی ناٹک کمپنی کے ایکٹر ہیں مگر نہیں۔قیافہ اس کی تصدیق نہیں کرتا۔ایکٹروں کے چہرے پر میں نے عموماً ابتذال اور روکھے پن کے آثار پائے ہیں اور یہاں متانت، شرافت، سنجیدگی اور حیا نے حسن میں وقار پیدا کر رکھا ہے۔

شاہد آں نیست کہ دارد خطِ سبز و لب لعل
شاہد آں ست کہ ایں دار و دوانے دارد
(محبوب وہ نہیں جو سبز دھارا اور لعل لب رکھتا ہو بلکہ محبوب تو وہ جو عاشق رکھتا ہو۔)

علاوہ ازیں نقش ونگار اُس طبقے کے نہ تھے جس سے اسٹیج کو رونق دی جاری ہے بلکہ چہرے کے مہین نقوش اور جسم کی ساخت دیکھ کر شبہ ہوتا تھا کہ ہمارا قاتل کوئی پرنس۔راج کمار یا کہیں کا شہزادہ ہے مگر پھر مہندی اور جوڑے کے کیا معنی؟ ممکن ہے مَنّت کے بال ہوں اور اور مہندی اس عمر میں شوخ چشم ،رنگین مزاج نازنین اکثر لگا لیا کرتے تھے لیکن آکر اس پوزیشن کے شخص کا ایسے سادہ لباس میں ہونا اور پیدل چل کر آنا کیا معنی رکھتا ہے۔خصوصاً اس درجے بانکپن اور اندازِ دل ربائی کے ہوتے ہوئے؟

سعیِ تاویل خیالات اس خطرے کا جواب تراشنے نہ پائی تھی کہ نازک انگلیاں متحرک ہوئی، جیب سے پان کی ڈبیہ نکالی گئی اور نہایت شفاف اردو اور لکھنؤ کے لوچ دار لہجے میں مجھ سے دریافت فرمایا گیا کہ ”جناب، پان سے شوق فرمائیں گے؟ اور بلا کسی جواب کے انتظار کے ڈبیہ سے ایک گلوری نکال کر میری طرف بڑھائی گئی۔مَیں نے کپکپاتے ہوئے ہاتھ سے پان لیا۔کھڑے ہو کر حیدر آبادی طرز میں جھک کر تین مرتبہ آداب بجا لایا۔ان کی نظر بچا کر پان کو آنکھوں سے لگایا، پھر اُسے منہ میں رکھ لیا۔سبحان اللہ۔اس پان کی لذّت کو کیوں کر بیان کروں۔
لکھنؤ کا بیگمی پان۔کتھا، چونا، تمباکو، بالکل لکھنؤ کا سا۔حیرت پر حیرت۔یا اللہ یہ گجراتی لباس

میں لکھنؤ کا شہزادہ ہے یا کوئی لکھنؤ کا تربیت یافتہ گجراتی پرنس۔ زبان اور لب ولہجہ اس قدر پاکیزہ۔ پان کا مذاق اس درجے سلیم۔ آخر ماجرا کیا ہے؟

''معاف فرمائیے گا۔ یہ عرض کرنا بھول گیا کہ اس میں تمباکو ہے جناب کو تمباکو سے تو پرہیز نہیں''

''جی نہیں۔ اس قدر لذیز پان ہے کہ جب سے اس بمبئی میں آیا ہوں ایسا پان نصیب نہیں ہوا۔ اگر خلافِ تہذیب نہ ہوتا یا خدمتِ والا میں تکلفی کا شرف حاصل ہوتا تو یقیناً ایک پان اور طلب کرتا۔''

''حسنِ طلب کی داد دیتا ہوں لیکن دوسرا پان اب کل اسی وقت اور اسی مقام پر''۔ ایک تباہ کن تبسم سے یہ جملہ فرمایا اور اُٹھ کر چل دیے۔

پھر ہوا ہم کو دل و دیں کا بچانا مشکل
نگہِ ناز کا پھر ہم سے تقاضا ہے وہی

☆☆☆☆☆

(۲)

اس قدر ہے دراز ہجر کی رات
پر تڑپنے سے جی نہیں بھرتا

کروٹیں لیتے لیتے تھک گیا مگر گھڑی میں ابھی رات کے بارہ ہی بجے ہیں۔ کیا آج سَحر نہ ہوگی۔ کیا اب کل شام کے پانچ نہ بجیں گے۔ شبِ فراق! تیرا منہ کالا۔ تو کس قدر تکلیف دہ، کس قدر بے چین کرنے والی ثابت ہوئی۔ زمانے بھر کی تاریکیوں کو سمیٹ کر تو کس قدر بھیانک ہوگئی ہے۔

ہجر کی ایک شب نے دکھلائے
سیکڑوں دن مجھے قیامت کے

آج دن میں، مَیں نے اپنے لیے تھیٹر میں ایک کرسی رزرو کرائی تھی۔ اس دلِ شوریدہ سر نے جانے نہ دیا۔ چلا جاتا تو رات کا بڑا حصہ شاید کسی قدر آسانی سے کٹ جاتا۔

دن ہو گو لاکھ مصیبت کا پھر آخر دن ہے
پیٹتا ہے شبِ غم کا کہ سحر کیوں کر ہو

بیٹھے بٹھائے یہ مَیں نے مفت سودا مول لیا۔ مصیبت سر پر لی۔ مَیں نے کیوں اُن کی طرف دیکھا، کیوں ان سے پان لیا، کیوں ان سے باتیں کیں۔ بھلا چنگا تھا کیوں یہ مرض لگا یا مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ مَیں نے کچھ نہیں کیا بلکہ اپنے ابھرتے ہوئے شوق کو دبایا۔ اپنے دل کو مسوس کر کے رہ گیا۔ خدا گواہ کہ کسی قسم کی پہل اپنی طرف سے نہ ہونے دی۔ انھوں نے پان دیا تو مجبوراً میں نے اُسے لے لیا۔ انھوں نے بات کی تو خواہ مخواہ مجھے بھی جواب دینا پڑا۔ بار بار دیکھا۔ چوری سے دیکھا، کن انکھیوں سے دیکھا مگر کوئی چیز خود بہ خود سامنے آوے تو اسے کیسے نہ دیکھے۔ جلاد شمشیر برہنہ لیے اپنی خدمت کی انجام دہی کے لیے بالمقابل ہو تو آنکھیں اس کی طرف سے کیوں کر ہٹ سکتی ہیں۔ موت کی جامہ زیبی پر کسی کو وجد آ جاوے اور وہ دیوانہ وار اپنے مطلوب کی جا یہ کہتا ہوا بڑھے کہ۔

اگر منظور قتلِ من تغافل چیست قاتل
کہ سر بکف، کفن بردوش، گردِ دار می گردم

تو فرمایئے کہ اس دنیا میں کون سی قوت اسے جان باز اور جان نثری کے ولولے سے باز رکھ سکتی ہے۔ ہاں تو پھر ______ ”دوسرا پان اب کل۔ اسی وقت اور اسی مقام پر“

آخر اس کے معنی کیا ہو سکتے ہیں۔ کیا یہ بھی کوئی ادا تھی۔ کیا صاحب زادہ صاحب کچھ تاڑ گئے مگر کوئی یہ تو بتائے کہ میں ایک شریف زادہ کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کیوں کر اور کس پیرائے میں کروں گا۔ ہاں۔ ہاں میں انھیں شریف زادہ سمجھنے پر مجبور ہوں۔ اس کے خلاف کچھ نہ سنوں گا۔ کسی کی نہ مانوں گا۔ بلا شبہ وہ عظمت و عصمت کے دیوتا ہیں۔ حیا و شرم کے زیور سے آراستہ ہیں، پاک باز ہیں، پاک طینت ہیں، فرشتہ خصلت ہیں؛ تو کسی شریف زادے سے میں کیا کہوں گا اور کس طرح کہوں گا۔ یہ کہہ نہیں سکتا کہ جن نگاہوں سے میں آپ کو دیکھتا ہوں۔ ان نگاہوں سے آپ بھی مجھے دیکھیں۔ کیوں کہ مَیں ان کا سا حسن کہاں سے لاؤں جو ان کے دل میں کُھب جاؤں۔ یہ کہتا ہوں کہ آپ اپنے قدر دان کی قدر فرمایئے تو وہ اس قدر دانی کے محتاج

نہیں۔ یہ کہتا ہوں، ترس کھائیے، رحم فرمائیے تو پان کی تواضع سے بھی کہیں محروم نہ ہو جاؤں۔
وقت یہ ہے کہ صاحب زادے ہیں۔ اور مَیں اس روشِ خام میں ناتجربہ کار محض۔
بے زبانی! تیرا سہارا ہے۔ تیری بلاغت پر اعتماد ہے۔ تیری قوّت کا معترف ہوں تو ہی کچھ اپنے
جوہر دکھا سکتی ہے۔

بے زبانی ترجمانِ شوق بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

کل وہ نہ آئے تو کیا ہوگا، نہ نام معلوم ہے نہ پتا۔ اس لق و دق شہر میں انھیں کوئی ڈھونڈنے نکلے بھی تو کہاں مگر نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔ وہ آئیں گے۔ ضرور آئیں گے" کل اسی وقت اور اسی مقام پر" یہ فقرہ کچھ ان تیوروں سے کہا گیا تھا کہ معنی پیدا ہوتے تھے۔ اس مسئلے پر غور نہیں کیا کہ انھوں نے آخر پان کیوں دیا۔ لباس میرا انگریزی، سر پر فیلٹ، نہ ان کا سا ہندوستانی لباس، نہ ان کی طرح لبوں پر لاکھا، نہ دانتوں میں پان کی ریخیں، پھر انھوں نے کیسے جانا کہ مَیں پان کھاتا ہوں۔ ممکن ہے کہ چہرے سے ہندوستانی ہونا معلوم کر لیا ہوگا اور خود پان کھانے سے قبل اخلاقاً ایک پان مجھے بھی مرحمت فرما دیا۔ کل آفس کا کام بھی تو بہت ہے۔ خطوط بکثرت آئے ہوئے ہیں۔ جن کے جوابات لکھنے ہیں۔ چند اشخاص سے ملنے کا بھی وعدہ ہے، بعض آرڈروں کی تعمیل بھی ضروری مگر کل تو مجھ سے کوئی کام نہیں ہو سکے گا۔ کل ہی پر کیا موقوف اگر یہ انگیٹھی یوں ہی دہکتی رہی تو بس کاروبار کا اب خدا حافظ۔

اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل
سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

آج رہ رہ کے رونا کیوں آرہا ہے؟ اس رونے میں یہ لذّت پوشیدہ کیسی ہے، جس سے طبیعت ذرا ہلکی اور دل کو قدرے تسکین ہوتی ہے۔

خود سمجھتا ہوں کہ رونے سے بھلا کیا حاصل
پر کروں کیا یوں ہی تسکین ذرا ہوتی ہے

اس وقت دوست احباب بھی تو کام نہیں آتے۔ پیر پھیلائے اپنے مزے کی نیند سو رہے ہوں گے۔ میری آج کی سرگذشت سنتے تو بہ جائے ہم دردی کے مضحکہ اڑاتے۔ بہ جائے تسکین کے دل کی تکلیف کو بڑھا دیتے اور ایسی نصیحتیں کرتے جن پر کار بند ہونا میرے لیے بہ حالت موجودہ ناممکن ہوتا۔

نہ یارے آں چناں محرم کہ از وے یار یئے آید
نہ دل دارے چناں مشفق کہ از حالِ حسنؔ پرسد

(نہ یار ایسا محرم ہے کہ اس سے مدد مل سکے اور نہ محبوب ایسا مہربان کہ حسن کا حال پوچھ لے۔)

میرے اس وقت کے ہم دم وانیس۔ اس وقت کے یار و مددگار بس یہی دو ہیں۔ جنھیں خدا سلامت رکھے۔ سینے میں آگ اور آنکھوں میں آنسو۔

دل میں سوزش ہے آنکھ میں آنسو
عشق ہے کھیل آگ پانی کا

☆☆☆☆☆

(۳)

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

نہیں آیا، ابھی تک نہیں آیا۔ وہ وعدہ ایفا کرنے والا اب تک نہیں آیا۔ مجھے بلانے والا ابھی تک نہیں آیا۔ میرے پان کی گلوری ابھی تک نہیں آئی۔ میرے دل میں گدگدی پیدا کرنے والی انگلیاں اب تک نم نہ ہوئی۔ یہ کیا قیامت ہے کہ گھڑی کی رفتار بھی دھیمی پڑ گئی مگر اس میں اُس بے چارے کا کیا قصور۔ اس نے کب کہا تھا کہ تو تین ہی بجے سے آجانا۔ وہ آئے گا اور ضرور آئے گا لیکن وقت پر۔ وہ اس طبقے کے لوگوں میں سے نہیں جو وعدہ ایفا نہیں کرتے۔ میری گھڑی شاید بند ہوگئی، نہیں نہیں۔ چل رہی ہے مگر سست چل رہی ہے۔ اب میں کسی گھڑی ساز سے اسے درست

کرنے کو کہوں گا۔اے سمندر! تو کیوں مستیوں میں آ رہا ہے،تو کیوں لہروں سے کھیل رہا ہے۔کیا تجھے پان کی گلوری مِل گئی؟ کیا تو مجھ پر ہنس رہا ہے؟ مجھے چھیڑ رہا ہے۔ مجھے کھجا رہا ہے۔تُو لے دیکھ۔میرا بانکا وہ آ رہا ہے۔رفتار کس قدر البیلی ہے اور سیاہ ٹوپی نہیں بلکہ پجامہ،انگرکھا اور عمامہ ہے۔کاٹھیاواڑی والیانِ ملک کا لباس ہے،جُوڑا نہیں ہے بلکہ بال عمامے کے نیچے ایک ترکیبِ خاص سے چھپے ہوئے ہیں۔کانوں میں دو سنہری بندے لٹک رہے ہیں۔جن سے حسن اور بھی دمکنے لگا ہے۔گاڑی کرائے کی نہیں معلوم ہوتی مگر بڑی دور سے وہ اس پر سے اُترا ہے اور وہاں سے پیدل آ رہا ہے۔اب خراماں خراماں میری جانب بڑھ رہا ہے۔مَیں نہ کہتا تھا کہ کوئی پرنس ہے، شہزادہ ہے،راج کمار ہے،کسی ریاست کا ولی عہد یا ولی عہد کا بھائی ہے لیکن اگر ایسا ہے اور یقیناً ہے تو بس موت کا سامنا ہے۔مجھ غریب کی جانب وہ کیوں التفات کرنے لگا۔اے دل! سنبھل، وہ دشمنِ جاں قریب آ پہنچا۔اُٹھ اور اس کے قدموں پر نثار ہو جا مگر ٹھہر از خود رفتہ نہ ہو۔ہوش وحواس ابھی سے نہ کھو بیٹھ۔کسی قدر عقل سے کام لے۔اس کی شان وعظمت کے خلاف کوئی حرکت سرزد نہ ہو۔بس اسی پر قناعت کر کہ وہ آئیں تو کھڑے ہو کر اُن کا خیر مقدم کر اور نیچی نگاہ اور بھرائی ہوئی آواز سے خیریت مزاج دریافت کر۔

مجنوں کی طرح ہم کوئی قصہ نہ کریں گے
مر جائیں گے اظہارِ تمنا نہ کریں گے

تشریف لے آئے۔سُن کیا فرماتے ہیں۔تسلیمات عرض ہے۔مزاجِ اقدس۔آپ کو انتظار کی زحمت تو برداشت نہیں کرنی پڑی۔مجھے شاید کسی قدر دیر ہو گئی۔معاف فرمایئے گا۔

مَیں:''جی نہیں،جناب نے تو دیر نہیں فرمائی۔مَیں ہی ذرا وقت سے پہلے آ گیا تھا۔آج کل جی گھبراتا بہت ہے۔کام میں جی لگتا ہے نہ لوگ اچھے معلوم ہوتے ہیں۔بس تنہائی میں طبیعت کو کسی قدر سکون حاصل ہوتا ہے۔سمندر کے کنارے اکثر آ جاتا ہوں اور ان موجوں سے جی بہلایا کرتا ہوں۔فرمایئے حضور کا مزاج تو اچھا ہے؟''

وہ:''خدا کا شکر ہے کہ اب اچھا ہوں۔طبیعت ذرا ناساز ہو گئی تھی مگر بفضلہٖ کل سے افاقہ ہے۔آپ

کی دعا سے امید ہے کہ بقیہ شکایت بھی دور ہو جائے گی۔ لیجیے یہ آپ کے پان ہیں۔ یہ فرمایا اور ایک چاندی کی ڈبیہ میری طرف بڑھائی۔ ڈبیہ نہایت خوب صورت تھی اور نقش ونگار سے مزیّن۔ صافی نہایت ہلکے سے خس میں بسی ہوئی تھی۔ گلوریوں پر چاندی کے ورق تھے۔ ''لیجیے یہ آپ کے پان ہیں۔'' اس کے کیا معنی؟ کل مَیں نے دوہرا حصّہ طلب کیا تھا۔ شاید منشا یہ ہو کہ اپنے حصّے کے دو پان نکال لوں۔ چناں چہ ڈبیہ میں سے پان نکالنے لگا۔'' فرمایا ''انھیں رہنے دیجیے۔ یہ آپ کے کل اس وقت تک کے پان ہیں۔ ان سے گھر جا کر شوق فرمایئے گا۔ ورنہ کم ہو جائیں گے۔ اس وقت آپ میری ڈبیہ کے پان ملاحظہ فرمائیں۔''

یہ کہا اور جیب سے اسی نوعیت کی دوسری ڈبیہ نکال کر میری طرف بڑھا دی۔ مَیں آداب بجا لایا اور دل میں کہنے لگا۔ ؎

لغزش نہ ہو بلا ہے حسینوں کا التفات
اے دل! سنبھل وہ دشمنِ دیں مہرباں ہے اب

ان کی ڈبیہ کے پانوں پر چاندی کے ورق نہ تھے۔ کچھ خیال آیا بے چین سا ہُوا اور لڑکھڑائی ہوئی زبان سے عرض کرنے لگا۔ ''حضور نے پانوں کی یہ زحمت کیوں گوارا کی۔ مجھ بے کس اور کسمپرس پردیسی کی حالاتِ زار پر کیوں اس قدر توجہ فرمائی۔ مجھ گم نام ناچیز پر کل سے کیوں اس درجے عنایات مبذول ہیں۔ میرے اجڑے ہوئے دل پر یہ آب پاشی کیوں ہو رہی ہے۔ آخر فرمایئے تو کہ حضور کی ان عنایات سے میرا دل پامال کیوں ہو رہا ہے۔ ؎

آدمی ظلم کا مارا تو پنپ جاتا ہے
مہربانی سے مٹاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

وہ: ''للہ آپ مجھے حضور کے لفظ سے مخاطب نہ کریں، مَیں آپ کا ایک ادنا خادم ہوں۔ شرمندہ نہ کریں، کانٹوں میں نہ گھسیٹیں، مَیں جانتا ہوں کہ کس کے سامنے ہوں۔ آپ سے عرصے سے واقف ہوں گو آپ مجھ سے واقف نہیں۔ نہ فی الحال آپ مجھ سے واقف ہو سکتے ہیں۔ باہمی روشناسی کا ابھی وقت نہیں آیا مگر وہ وقت قریب ہے کہ آپ مجھے پہچان لیں گے۔ آپ کو یقین

ہو جائے گا کہ اس وقت کا میرا ایک ایک لفظ صداقت پر مبنی ہے۔ مَیں اس شہر میں دو برس سے آپ کی تلاش میں تھا۔ مجھے علم ہے کہ آپ کس برگزیدہ خاندان کے فرد ہیں۔ مَیں جانتا ہوں کہ آپ کب سے بمبئی میں وارد ہیں اور یہاں آپ کے مشاغل کیا ہیں۔ مَیں آپ کی زندگی کے ذرّے ذرّے حالات سے باخبر ہوں۔ مَیں اور میرا ایک رفیق اس معاملے میں ہم راز ہیں۔ مجھے آپ سے ملنے کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے مَیں وقت کا منتظر تھا۔ خدا خدا کر کے وہ مبارک وقت کل نصیب ہُوا کہ میں آپ سے مل لیا اور آپ مجھ سے عجلت سے کام نہ لیجیے۔ صبر و تحمل کا کام میں لائیے۔ رفتہ رفتہ سارا راز کُھل جائے گا۔ میرے اور آپ کے درمیان رازہائے سر بستہ کا ایک سلسلہ ہے جس کی درازی اور پیچیدگی کسی معشوق کی زلفِ مسلسل سے کم نہیں۔ میری اور آپ کی کل ملاقات میں ایک راز تھا۔ آج کی پان کی ڈبیہ میں ایک راز ہے۔ یہ ڈبیہ کل خالی ہو جائے تو لے آیئے گا۔ پرسوں کام آئے گی۔ کل دوسری ڈبیہ میں آپ کے لیے پان آجائیں گے۔ پان کے آپ شوقین معلوم ہوتے ہیں۔ اس شہر میں آپ کے مذاق کے پان آسانی سے نہیں ملتے۔ اس لیے یہ خدمت مَیں نے اپنے ذمّے لی ہے۔ میرے ہاں لکھنؤ سے پان آنے کا انتظام ہے۔ مَیں انشا اللہ لکھنؤ کے پان آپ کو روز کھلایا کروں گا۔ کل پھر اسی وقت تکلیف فرمایئے مگر کولابہ ریکلی میشنز پر۔ اس قسم کی ملاقاتیں روزانہ ایک ہی مقام پر اصول کے خلاف ہیں۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔ آج کسی قدر عدیم الفرصت ہوں۔ خدا حافظ۔

آمدی و آتشم بر جاں زدی
رفتی و بر آتشم داماں زدی

(تُو آیا اور میری جان میں آگ لگا دی اور جب جاتے جاتے اس آگ کو دامن کی ہوا دے گیا۔)

☆☆☆☆☆

(۴)

ہاتھ دوڑائے جنوں نے پھر گریباں دیکھ کر
پاؤں پھر وحشت نے پھیلائے بیاباں دیکھ کر

وہ تو اٹھے اور اٹھ کر چل دیے۔ ادھر میں ہوں کہ مبہوت سمندر کو تک رہا ہوں۔ راز سربستہ بلکہ رازہائے سربستہ جن کی درازی اور پیچیدگی کو معشوق کی زلفِ مسلسل سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ آخر کیا ہو سکتے ہیں۔ یہ معمّہ کیا ہے۔ وہ مجھے خوب جانتے ہیں۔ میرے خاندان سے واقف ہیں مگر مَیں ان سے واقف نہیں، نہ ابھی واقف ہو سکتا ہوں گو روشناسی کا وقت قریب آ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا راز ہے؟ کل کی ملاقات میں ایک راز۔ آج کی پان کی ڈبیہ میں ایک راز۔ پھر غضب یہ کہ ان کا ایک راز دار بھی ہے۔ میرے اور ان کے معاملات میں آخر راز دار کون ہو سکتا ہے۔ کوئی رقیب تو درمیان نہیں۔ سر چکرا رہا ہے۔ عقل کام نہیں کرتی، آنکھوں کے آگے تاریکی چھا گئی، پیر لڑکھڑا رہے ہیں۔ گھر جانے کی طاقت نہیں، اٹھا اور اُٹھ کر پھر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر سکوت میں رہا۔ جیب سے پان کی ڈبیہ نکالی۔ کس درجے نفاست مذاق کا ثبوت دے رہی ہے۔ آنکھوں سے لگاتا رہا۔ کلیجے پر ملتا، بالآخر اسے کھولا اور ایک پان اس میں سے نکالا، انگلی نے کسی چیز کا احساس کیا۔ دیکھا تو پاؤں کی تہہ میں ایک کاغذ سونے کا ورق میں لپٹا ہوا رکھا تھا۔ اٹھا اور اٹھ کر برقی لیمپ تک گیا۔ نہایت احتیاط سے کاغذ کی تہہ کھولی کچھ لکھا ہوا تھا۔ پڑھا تو یہ شعر تھا۔

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

کچھ عقل کام نہیں کرتی کہ یہ شعر حالاتِ موجودہ پر کیوں کر چسپاں ہو سکتا ہے۔ ڈبیہ میں یہ کیوں ہے اور اس کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ دماغ صحیح ہوتا تو کچھ غور و خوض کرتا حالتِ جنوں میں سوچوں بھی تو کیا۔ مشورہ تک بھی تو کسی سے نہیں لے سکتا۔

عاشق شدم و محرم ایں کار ندارم
فریاد کہ غم دارم و غم خوار ندارم

(مَیں عاشق ہُوا ہوں اور مرے پاس اس کام کا کوئی محرم نہیں ہے۔ افسوس تو غم تو رکھتا ہے مگر غم خوار نہیں۔)

انھیں پیروں واپس آیا اور اسی بنچ پر بیٹھ کر بہت گہرے سکوت میں جا پہنچا۔

پھر محوِ خیالِ رخِ جاناں نہ ہُوا ہے
پھر شیشۂ دل اپنا پری خانہ ہوا ہے

تھوڑی دیر اسی محویت میں رہا کہ کچھ نیند سی آ گئی ایک عجیب وغریب خواب دیکھا ہے جسے بیان کروں تو لوگ دیوانہ کہیں۔ اِس لیے چپ ہوں۔ آنکھ کھلی تو صبح تھی۔

اس وقت ہے دعا و اجابت کا وقت میر
اک نعرہ تو بھی پیشکشِ صبح گاہ کر

اُٹھا، چلا، ٹرام پر سوار ہوا اور گھر آ پہنچا۔

☆☆☆☆☆
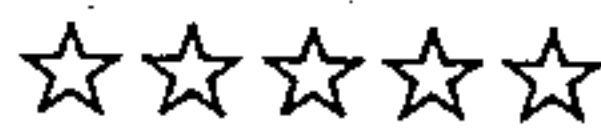
(۵)

روزِ وداع بھی شبِ ہجراں سے کم نہیں
کچھ صبح ہی سے شامِ الم کا ظہور تھا

نہ معلوم کہ یہ دن کس الجھن میں گزرا کہ نہ کوئی کام ہوا نہ کاج، نہ ڈاک دیکھی۔ نہ دفتر میں بیٹھا نہ کسی سے ملاقات کو جی چاہا۔ بس ایک ہی کام ہو سکا جو بہت اہتمام سے کیا گیا۔ پان کی ڈبیہ میں جو شعر نکلا، وہ یہ تھا۔

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ ایک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

سمجھا تو میں خاک نہیں کہ اس شعر کا یہ کون سا موقع ہے مگر اس کے جواب میں ایک شعر لکھ دینے کی ضرورت پیش آئی تاکہ چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ جاری ہو۔ ایک خوش نما باریک فینسی کاغذ لیا اور

ایک خوش نویس دوست سے بہت خوب صورتی کے ساتھ یہ شعر اس پر لکھوایا۔

تمھیں غمزوں میں آساں ہے معانی کا ادا کرنا
مجھے لفظوں میں مشکل ہے بیانِ مدعا کرنا

اس کاغذ کو مثلث تہہ کیا یعنی پان کی طرح اسے دل کی صورت پر موڑا۔ گلاب کے پھول کی پتیوں کو اس پر لپیٹا ایک چھوٹا سا نازک اور خوب صورت سونے کا تیر بنوایا جسے گلاب کی پتیوں میں لپٹی ہوئی اس دل نما شے میں چبھودیا پھر اسے چاندی کی اس ڈبیہ کو جیب میں ڈال وقتِ مقررہ پر کولابہ ریکل میشنز چل دیا۔

پھر وہیں لے چلا مجھے دیکھو
دلِ خانہ خراب کی باتیں

☆☆☆☆☆

(۶)

گہہ بلطفم می نوازد گہہ بنازم مے کشد
زندہ می سازد مرا آں شوخ و بازم مے کشد

(وہ کبھی مہربانی اور کبھی ناز سے مار دیتا ہے۔ وہ شوخ مجھے زندہ کر کے پھر مار دیتا ہے۔)

آج مجھے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ میں وہاں پہنچا ہی تھا کہ ایک موٹر آ کر رکا۔ اس میں سے میرا گل فام اُترا۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر موٹر کی جانب یہ کہتا ہوا واپس ہوا کہ: آیئے آج ملابار ہلس کی سیر کریں، سیٹ پر کسی قدر بحث ہوئی، وہ اپنی داہنی جانب بٹھاتے تھے۔ میں سامنے بیٹھنا چاہتا تھا۔ نہ مانے ناچار داہنی جانب ہی بیٹھنا پڑا۔ دروازہ بند ہوا۔ گرد وغبار کے خیال سے ٹپ چڑھا دیا گیا اور موٹر رواں ہوا۔ کاش اس وقت کوئی میری طرف سے شوفر سے درخواست کرتا کہ رفتار ذرا دھیمی کر دے۔

نمی جواہم فلک از کج رو یہائت کہ برگردی
شبِ وصل ست خواہم اند کے آہستہ تر گردد

(اے فلک! مَیں یہ نہیں چاہتا کہ تو اپنی کج روی کو چھوڑ دے۔ بس اتنا چاہتا ہوں کہ وصل کی رات کچھ آہستہ ہو جا۔)

آناً فاناً ہم ملابار ہلس کی بالائی سطح پر پہنچ پھر کسی قدر نشیب میں اترے۔ موٹر نے ایک پر پیچ راستا طے کیا اور ایک مکان کے پورٹیکو میں داخل ہوئے۔ کمرہ نہایت سلیقے سے آراستہ تھا۔ پشت کی کھڑکیوں سے سمندر کا دل چسپ نظارہ پیشِ نظر تھا اور ادھر اُدھر کی کھڑکیوں سے اُس پُر فضا اور فرحت بخش مقام کی سیر ہوتی تھی جو اس مکان کو تین طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ موٹر میں ہم دونوں بالکل خاموش رہے، نہ مزاج پرسی ہوئی نہ بات چیت، ایک سناٹے کا عالم تھا جو دونوں پر طاری تھا۔

در بزمِ وصال تو بہ ہنگام تماشا
نظارہ زجنبیدن مژگاں گلہ دارد

(ترے وصال کی محفل جب عروج پر ہوتی ہے تو نظارے کو آنکھ جھپکنے کی شکایت ہوتی ہے۔)

تھوڑی دیر میں یہ مسافت طے ہوگئی۔ کمرے میں داخل ہوئے تو انھوں نے کل والی پان کی ڈبیہ یہ کہہ کے طلب کی کہ: ''لایئے پان بنوالاؤں'' اور پانچ منٹ کی مہلت معذرت کے ساتھ طلب فرما کر ''ٹائمس'' کی تازہ اشاعت میرے سامنے رکھتے ہوئے مکان کے کسی دوسرے حصے کی جانب تشریف لے گئے۔

گِرد و پیش سین اس قدر دل فریب تھا کہ مَیں اعتدالی حالت میں ہوتا تو گھنٹوں لطف لیتا مگر اس وقت فرصت نہ تھی۔ اخبار پڑھنے کی بھی مہلت نہ تھی۔ یہ پانچ منٹ کا وقت مِلا تھا مَیں اپنے تخیلات سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ تین دن سے پے در پے جو بجلیاں مجھ پر گر رہی تھیں اُن سے سنبھلنے کی کوشش کرتا تھا۔ اُن کی موجودی میں میرے خیالات بھی تو دم بخود ہو جاتے ہیں۔ اب وہ پانچ منٹ کے لیے سامنے سے ہٹے ہیں تو چاہتا ہوں کہ میرے خیالات ان کا طواف کر لیں۔ انھوں نے آج عجیب شان میں جلوہ افروزی فرمائی نہ پرسوں والا لباس تھا، نہ کل والا۔ بلکہ لکھنؤ کا باریک لباس زیب بدن تھا اور سر پر گول بیش قیمت کام دار ٹوپی۔ آج ٹوپی کے نیچے جوڑا

بھی نمایاں تھا۔ جوڑے کے اردگرد جوئی اور چنبیلی کے پھول لپٹے ہوئے تھے۔ کانوں میں دُر، ناک میں ایک مہین سی کیل۔ انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں اور کلائی میں سونے کی اک باریک زنجیر، کتھک ہونے کا دھوکا ہوتا تھا مگر جو خیالات ان کے ایکٹر سمجھے جانے میں مانع تھے وہی ان پر کتھک کا قیاس ہونے کے سدِ راہ ہیں کیوں کہ جو شان ان پر برستی تھی جو وقار ان کے حسن و انداز سے پیدا ہوتا تھا، وہ بہت ارفع و اعلا تھا، لیجیے تشریف لے آئے۔ فرماتے ہیں:

''فرمایئے گا۔ ایک ضرورت سے مجبور ہو کر مجھے آپ کو تنہا چھوڑ کر جانا پڑا، ناگوار خاطر تو نہیں ہُوا۔''

مَیں: ''ہرگز نہیں بلکہ خوش ہوا کہ آپ نے بے تکلفی برتی۔ یہ مکان تو ماشاالله خوب ہے۔ کتنا اچھا منظر ہے۔ کن صاحب کا مکان ہے؟

وہ: ''یہ میرے ایک دوست کا مکان ہے جس موٹر پر ہم ابھی آئے ہیں، وہ بھی ان ہی کا ہے۔ مَیں انھیں کے ہاں رہتا ہوں، گویا عارضی مسکن یہی ہے۔ اس وقت آپ میرے مہمان ہیں یا باالفاظِ دیگر آپ ان کے مہمان ہیں۔''

یا اللہ! کہیں یہ ہی تو میرے رقیب نہیں۔ یہی تو وہ صاحب نہیں، جنھیں ہم راز و راز دار بیان کیا گیا ہے۔ آخری فقرہ انھوں نے ادا بھی کچھ تبسم آمیز لہجے میں کیا۔

مَیں: ''تین دن سے میری تمام قوتیں آپ ہی کی عنایات و نوازشات کے متحمل ہونے میں صرف ہو رہی ہیں۔ مَیں نیند کو خیر باد کہہ چکا ہوں۔ خورونوش کو سلام کر چکا ہوں، اپنے کاروبار کے دفتر کو مَیں نے تہہ کر دیا۔ اس تین دن کے عرصے میں کسی سے ملاتک نہیں، بات تک نہیں کی۔ درد اور بے چینی اب میرے مونس و ہم دم ہیں۔ آپ نے بڑی بندہ نوازی فرمائی جو میری جانب التفات فرمایا، مجھ پر عنایات مبذول کیں۔ اچانک اور بلا اطلاع سابق مجھے اپنے درِ دولت پر لے آئے اپنا مہمان بنایا پھر ان عزیات میں اپنے ساتھ کسی دوسرے کا نام کیوں شریک فرماتے ہیں۔ اغیار کے حوالے مجھے کیوں کرتے ہیں، کسی اور کا منت کشِ احسان مجھ کیوں بناتے ہیں۔ مَیں ہمیشہ سے ایک وقت میں ایک ہی کرم فرما کے زیرِ بار ہونے کا عادی ہوں۔ ع

شرم کی جا ہے کہ منت کش اغیار بنوں

دیوانہ نوازی فرمائی ہے تو اپنے اور اپنے دیوانے کے درمیان رقیب کو رخنہ اندازی کا موقع نہ دیجیے ع

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ

غلطی ہوئی معاف فرمایئے، میری مجنونانہ بڑ پر مطلق التفات نہ کیجیے جو مزاج والا میں آئے، شوق سے عمل میں لایئے۔ سر تسلیم خم ہے۔ تین دن سے اپنی زبان روکے ہوئے تھا۔ مَیں اس وقت بھی ان کلمات کو منہ پر لانا نہ چاہتا۔

ہم تو اس مدعا کے قائل ہیں
جو زباں سے نکل نہیں سکتا

مگر اس وقت طبیعت کچھ ایسی بھر آئی کہ ضبط محال ہو گیا اور چند بے معنی الفاظ زبان سے نکل گئے۔ معافی کا خواستگار ہوں۔ یہ کہا اور بے اختیار میرے آنسو نکل پڑے۔

مَیں رونے لگا حالِ دل کہتے کہتے
یکا یک بھر آئی طبیعت کچھ ایسی

مَیں ادھر اپنے جنوں سے الجھ رہا تھا، وہ اُدھر سکوت اور سناٹے کے عالم میں تھے۔ ان کے چہرے پہ پہلے فکر اور پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے پھر حزن و ملال کے، حتیٰ کہ اُن کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپک پڑے۔

مرے آنسوؤں نے مجھے بخشوایا
بڑے کام آئے یہ لڑکے مچل کے

جیب سے ایک لیونڈر میں بسا ہوا دھانی رنگ کا ریشمی رومال نکالا اور میرے آنسو پونچھے گئے۔

ایسا رونا نصیب ہو کس کو
آنسو پونچھیں وہ اپنے دامن سے

ان کی یہ ادا سمندِ ناز پر تازیانہ ہو گئی۔ ان کی اس عنایت نے آنسوؤں کی رفتار کو تیز

کردیا۔ دل کا رہا سہا استقلال کھو دیا۔ یا وہ ہیں کہ آنسو پونچھے چلے جاتے ہیں اور چپ کے چپ کے کہتے جاتے ہیں کہ: ''ان آنسوؤں کے قربان، ان سسکیوں پہ نثار، اپنی متانت ذرا اور قائم رکھو، تمھیں میرے سر کی قسم، جان ہلکان نہ کرو۔ پسِ پردہ کوئی سن رہا ہے، کوئی دیکھ رہا ہے۔''

''دیوار گوش دارد'' کا فقرہ کچھ اس آہستگی سے کہا کہ مَیں اُسے پورے طور پر سُن بھی نہ سکا۔

مَیں نے انھیں نرم کلائی سے اپنی جانب کھینچ کر سوفے پر اپنے قریب بٹھا لیا اور نہایت عجز وانکسار کے لہجے میں چپ کے چپ کے پوچھنے لگا کہ: ''اچھا یہ بتا دو کہ تم کون ہو؟ نہ بتایا تو بس میری زندگی کا خاتمہ''

کہا: ''صبر کرو، دو منٹ ٹھیرو، ابھی بتاتا ہوں۔'' یہ کہہ کے وہ اٹھے اور بجلی کا بٹن دبایا۔ روشنی ہوگئی۔ کمرہ بقعۂ نور بن گیا۔ اس وقت شام کی تاریکی چھا چکی تھی، یہ سارا سین شام کے جُھٹپٹے میں ہوا تھا۔

بجلی کی روشنی نے اُس وقت کمرے میں ایک دل فریبی پیدا کردی۔ میرے یوسف نے ٹوپی اتاری، جُوڑا کھولا، بال جھٹکے اور انھیں اپنے شانوں پر بکھیر کر چھوڑ دیا، پھر میرے ہی سوفے پر دوسری جانب نہایت رعنائی سے تکیہ لگا کر بیٹھ گئے اور میری نظروں میں نظریں ڈال کر فرمانے لگے۔ ''جی، اب فرمایئے کہ میرا چالان کس عدالت میں ہُوا ہے؟

وہ: ''عدالتِ فوجداری میں۔ وارنٹ بلا ضمانت پر آپ گرفتار ہو کر آئے ہیں، آگے چلیے۔''

مَیں: ''جرم؟''

وہ: ''وفا، آگے چلیے۔''

مَیں: ''پھر اب اس کی سزا؟''

وہ: ''حبسِ دوام اور عبورِ دریائے شور، آگے بڑھیے۔''

مَیں: ''مجسٹریٹ کا نام، پتا نشان، ولدیت، سکونت؟''

وہ: ''سبحان اللہ، مجسٹریٹ نہ ہُوا ملزم ہوا۔ نام، پتا، نشان، ولدیت، سکونت، پیشہ، پھر انگوٹھے کا نشان بھی طلب کیا جائے گا، اس کی ضرورت، اس سے بحث؟ بس یہ کافی ہے کہ مجسٹریٹ ذی

اختیار ہے۔"
مَیں: "آخر یہ تو معلوم ہو کہ ان اختیارات کا ماخذ کیا ہے؟"
وہ: کیوں؟ کیا اپیل کا ارادہ ہے؟"
مَیں: جی نہیں، اپیل کی سکت ہی کس میں ہے اور اس کی ضرورت ہی کیا ہے یہاں تو "سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے"
وہ: "تو پھر صبر کیجیے اور اس مصرع کو یاد رکھیے۔ اس سے کام لیا جائے گا۔"
مَیں: "مجھے [illegible]، مَیں تو اس دنیا میں آیا ہی صبر کے لیے ہوں۔ مَیں آپ کے ہر فیصلے پر سر جھکا چکا ہوں۔ آپ کے ہر حکم کی تعمیل کو حاضر ہوں۔ درخواست بس اتنی ہے کہ مجھ پر رحم فرمایا جائے اور میری الجھن کو دفع کر دیا جائے۔ کم از کم اتنا تو مجھ پر ظاہر فرما دیا جائے کہ مَیں آخر ہوں اس وقت کس کی حکومت میں۔"
وہ: "خدا کی"
مَیں: "بجا ہے، مجھے اس سے کب انکار ہے۔ آپ کو بھی تو مَیں خدا ہی کا فرشتہ سمجھتا ہوں لیکن آخر فرشتہ ہونے کے علاوہ آپ اپنے کچھ دیگر فضائل و مناقب بھی تو بیان فرمائیے۔"
وہ: "اچھا خیر۔ اگر آپ میں صبر کی اتنی بھی طاقت نہیں تو سنیے۔ مَیں کھاٹیاواڑ گجرات کی ایک ریاست کا رہنے والا ہوں۔ ایکٹر مگر پیشہ ور ایکٹر نہیں، بلکہ ایک شوقیہ اور امیر زادہ ایکٹر۔ آپ نے سنا ہوگا کہ اس خطے میں بعض والیانِ ریاست کو تھیٹر کا بہت شوق ہے۔ انھوں نے ذاتی کمپنیاں بنا رکھی ہیں جن میں اپنے خاص خاص احباب کے سامنے وہ خود بھی ایکٹ کرتے ہیں اور اپنے احباب اور احباب زادوں کو بھی اسٹیج پر لاتے ہیں۔ مَیں انھیں احباب زادوں میں سے ہوں۔ مجھے چوں کہ خود بھی ایکٹنگ کا شوق تھا۔ مَیں نے خاص طور پر اس فن کو حاصل کیا۔ اردو اور اردو کے لب و لہجے کی درستی کے لیے لکھنؤ گیا اور وہاں بیگمات کی سوسائٹی میں کچھ مدت بسر کی، زبان سیکھی، لب و لہجہ پختہ کیا، نشست و برخاست کے طریقے اخذ کیے، ناز و انداز کا چربہ اتارا، فی میل [female] ایکٹنگ کی غرض سے عورت بننے کی کوشش کی، بال بڑھائے، ناک کان چھدوائے، گانا بجانا سیکھا، کسی قدر ناچنے کی بھی مشق بہم پہنچائی۔ خدا نے کھانے کو دیا ہے، بس اپنے یوں ہی تفریح کرتا

پھرتا ہوں۔ تبدیلئ آب و ہوا کی غرض سے اور بعض دیگر مصلحتوں کی بنا پر چند روز کے لیے بمبئی آ گیا ہوں۔ اپنا نام و نشان، اس ریاست کا پتا اور چند دیگر امور ایسے ہیں جن کا افشا، اس وقت قرینِ مصلحت نہیں لیکن اطمینان دلاتا ہوں کہ عن قریب آپ کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ اِس وقت کوٹ وغیرہ اتار کر اطمینان سے مخلع بالطبع ہو کر بیٹھیے۔ آج آپ واپس نہ جا سکیں گے۔ رات قیام یہیں رہے گا۔ کل کا دن اور کل کی رات بھی یہیں رونق افروز رہیں گے۔ پرسوں کا آپ کو اختیار ہے۔ آپ کے گھر آپ کی طرف سے اطلاع بھجوا دی گئی ہے کہ پرسوں تک آپ کا انتظار نہ کیا جائے۔ آپ خیریت سے ہیں اور کسی قسم کی فکر نہ کی جائے۔''

مَیں (چونک کر): ''حضرت، میرے گھر کا پتا آپ کو کیسے لگا اور اطلاع آپ نے کہاں بھیجی؟''

وہ: ''مَیں نے کل عرض نہ کیا تھا کہ جتنا مَیں آپ اور آپ کے ماضی و حال سے واقف ہوں اُتنا آپ مجھ سے واقف نہیں، حتّٰی کہ آپ کے مکانِ موجودہ سے بھی بہ خوبی واقف ہوں۔''

میں: ''آخر یہ اَسرار کیا ہے؟ کجا مَیں، کجا آپ۔ مَیں ایک اجڑے دیار کا غریب، آپ امیر ابنِ امیر؛ مَیں دنیا کے اس سرے پر، آپ اُس سرے پر؛ مَیں ہندوستان، آپ کاٹھیاواڑ گجرات پھر میرے حالات سے اس درجے باخبری کے کیا معنی ہو سکتے ہیں، یہی تو وہ الجھاوَ ہے جس کے سلجھانے سے میرا دماغ قاصر ہے۔''

وہ: ''درست ہے۔ آپ ہندوستان اور مَیں کاٹھیاواڑ گجرات بااین ہمہ لکھنؤ کے لذیذ پان اس خاک سار ہی کے وساطت سے جناب تک پہنچتے ہیں۔ قبلۂ عالم، بارہا عرض کر چکا ہوں کہ صبر سے کام لیجیے، خدا کے لیے اپنی حیرت کو ذرا روکے رہیے، عن قریب سب کچھ آپ پر منکشف ہونے والا ہے مگر آپ ہیں کہ ضبط سے کام ہی نہیں لیتے۔ وقت کو غنیمت سمجھیے اور اس وقت مزے مزے کی باتیں کیجیے۔ حدیثِ از مطرب و مے گو'' (مطرب اور شراب کی بات کر۔)

میں: ''اچھا تو صرف اتنا فرما دیجیے کہ آخر اس لفظ عن قریب کا دور کب تک رہے گا۔

یہ دورِ جگر یہ بے قراری کب تک
یہ سوزِ دروں یہ آہ وزاری کب تک

اک دن دو دن کہ تا قیامت آخر
معلوم تو ہو جناب باری کب تک

وہ: ''صرف چوبیس گھنٹے۔''

مَیں: ''تو وعدہ کرتا ہوں کہ رازہائے سربستہ کے متعلق اب مطلق تجسس نہ کروں گا اور یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ ان عقدہ ہائے لاینحل کے حل کیے بغیر گھر بھی نہ جاؤں گا۔ یہ آپ نے خوب فرمایا کہ ''حدیث از مطرب و مئے گو'' اس کے لیے اس سے بہتر اور کون سا موقع ہوسکتا ہے۔ آپ کی صورت اتنی پاکیزہ، آپ کا حسن اس درجے نسوانی اور آپ کے انداز اس قدر البیلے ہیں کہ فی میل [female] پارٹ ادا کرتے وقت آپ قیامت ہی تو برپا کرتے ہوں گے۔ یہ کمر کمر تک کے بکھرے ہوئے بال، یہ مدھو بھرے نیناں، انکھیاں رسیلی، مہین مہین ہونٹ، ملاحت آمیز صبیح اور صباحت آمیز ملیح رخسارے، دمکتی ہوئی پیشانی، محراب دار ابرو، چاہِ ذقن، برق تبسّم اور تبسم کے وقت ادھر کے رخسار میں کنڈلی، پھر زبان کی شستگی، آواز کی شیرینی، لب و لہجے میں لوچ، مزاج میں متانت آمیز شوخی اور اس پر لکھنؤ کا گانا اور وہاں کی شوخ اور چلبلی ترکیبیں۔ ان چیزوں کی جب نمائش ہوتی ہوگی تو ہم جیسے دل پھینک اور کم زور طبیعت والوں پر نہ معلوم کیسی کیسی بجلیاں نہ گرتی ہوں گی۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ اس کمرے میں ہارمونیم بھی رکھا ہے اور طبلے کی جوڑی بھی موجود ہے۔ گستاخی تو ہوگی مگر اس بے باکانہ درخواست کی معافی چاہتا ہوں کہ آپ اپنے ایکٹنگ کے کپڑوں میں سے کسی اچھے سے زنانہ لباس کو زیبِ تن کیجیے اور اپنے گلے بازی کے کرشمے دکھائیے گا۔

میری اس تقریر کو انھوں نے نہایت پر لطف انداز سے سنا پھر متبسم ہوئے اور فرمایا: ''مَیں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کو اپنا فرض سمجھتا ہوں۔'' اور اُٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ دروازے پر آہٹ ہوئی، کواڑ کھلے اور میرا شاہدِ رعنا سبز رنگ کی ساڑی اور بیش قیمت جڑاؤ زیور سے مرصع ہو کر گجراتی وضع میں کہنیوں کہنیوں ہاتھ کھولے ہوئے منگرولی رفتار سے جسے میں رقصِ طاؤسی سے تعبیر کرتا ہوں، میرے سامنے آیا، جھک کر فرشی سلام کیا اور ہارمونیم کھول کر بیٹھ گیا۔ اس کے ہم راہ ایک کنیزک تھی۔ یہ سفید کپڑوں میں حسنِ ملیح کی ایک بھولی سی تصویر تھی جو

مؤدب پیچھے پیچھے آئی۔ نہایت ادب سے جھک کر سلام کیا اور نیچی نگاہیں کیے ہوئے طبلے کی جوڑی لے کر بیٹھ گئی، قبل اس کے کہ باجے پر انگلیاں پڑتیں مَیں نے کسی قدر مستانہ لہجے میں کہا: ''اتنی خوب صورت تم اس سے پہلے مجھے کبھی نظر نہ آئیں۔ یہ رُوپ تم پر اس قدر کھلتا ہے اور اس لباس میں تم اتنی دل کش اور پیاری معلوم ہوتی ہو کہ میرا جی چاہتا ہے کہ اس وقت تمھیں عورت ہی سمجھ کر مخاطب کروں۔ کوئی اجنبی شخص تمھیں اس رُوپ میں دیکھ کر گمان تک نہیں کرسکتا کی تم عورت نہیں۔ سر سے پیر تک بالکل عورت نظر آتی ہو۔ ایک سچ مچ کی عورت تمھارے پہلو میں اس وقت طبلے کی جوڑی لیے بیٹھی ہے مگر کوئی آنکھ تم میں اور اس میں بہ لحاظ نسائیت کے تفریق نہیں کرسکتی۔'' لکھنؤ میں رہ کر اس درجے نسائیت تم پر غالب آ گئی ہے کہ عورتیں بھی تمھیں زنانہ لباس میں دیکھ کر شرما ہی تو جاتی ہوں گی۔ شرماؤ مت، تمھیں شرمندہ کرنے کو مَیں نے یہ باتیں نہیں کیں بلکہ جو اثر اس وقت مجھ پر پڑا ہے۔ اس کا اظہار کر رہا ہوں، معاف کرنا۔ مَیں اس وقت پیار سے تمھیں ''تم'' کہہ رہا ہوں مگر ایک بات کا فیصلہ ہو جائے جب تک تمھارا اصلی نام مجھے معلوم نہ ہو، مَیں تمھیں کس نام سے پکاروں؟ دفع الوقتی کے لیے اپنا کوئی فرضی نام ہی میرے لیے مقرر کردو۔''

وہ: ''حضور جس نام سے پکاریں، مَیں جواب دوں گی۔ حضور خود ہی میرے لیے کوئی نام تجویز فرمادیں۔''

مَیں: ''جواب دوں گی! سبحان اللہ۔ ایکٹنگ بھی ہو تو پورا پورا اور مناسب بھی یہی ہے کہ اس لباس میں آکر اسی لباس والوں کی باتیں ہوں۔ ہاں تو کس نام سے پکاروں؟ گل فام کہنا تو مناسب نہیں، مَیں کسی سبز پری کا سایہ تم پر دیکھنا گوارا نہیں کرسکتا۔ یوسف کہوں تو زلیخا کہاں سے لاؤں پھر موجودہ لباس میں نہ گل فام کہہ سکتا ہوں نہ یوسف۔ ایسا نام ہونا چاہیے جو دونوں روپ میں کام دے، من موہن کہوں؟ مگر یہ تو اکھرا نام ہے۔ ایکٹنگ کے وقت موہنی کہنا پڑے گا، اور اس یائے تانیث کا کبھی ہونا کبھی نہ ہونا الجھن پیدا کرے گا۔ مَیں تمھیں سندر کہا کروں گا۔ اس میں تذکیر و تانیث دونوں کا لطف آسکتا ہے۔ سندر لال اور سندر بائی دونوں جائز ہے۔ سندر لال اور سندرت بائی دونوں جائز ہیں۔ اچھا سندر بسم اللہ کرو اور لکھنؤ سے جو چھریاں لائی ہو انھیں مجھ پر چلاؤ۔'' ہارمونیم بجا، طبلہ گونجا اور سندر نے نہایت دل کش ترکیب میں مولانا جامیؒ کی وہ نعت شریف سنائی جس کا مطلع یہ ہے۔

وصلی اللہ علیٰ نورٍ کزو شد نور ہا پیدا
زمیں از حبِ او ساکن فلک در عشق او شیدا

(درود اللہ کی طرف سے اس نور پر کہ جس سے سارے نوُر پیدا ہوئے۔زمین جس کی محبت میں ساکن ہے اور فلک جس کے عشق میں گھوم رہا ہے۔)

پھر ہندی میں خواجہ بزرگ اجمیری کی شان میں ع

''سنسار تہارو نام جپے اجمیر کے مورے کانہیا''

(اے اجمیر کے راجا، سارا سنسار تمھارے نام کی مالا جپتا ہے۔)

نہایت البیلے انداز سے الاپا، اس کے بعد مغربیؒ کی ایک توحید میں ڈوبی ہوئی غزل قوالی کی دھن میں سنائی۔ جس کا مطلع یہ تھا۔ ے

ہیچ کس را ایں چنیں یارے کہ مارا ہست نیست
کس ازیں بادہ کہ ماہستیم او سرمست نیست

(کسی کا بھی ہمارے یار جیسا یار نہیں اور ہم جس شراب سے مست ہوئے۔اُس سے کوئی نہیں ہوا۔)

مَیں نہیں کہہ سکتا کہ میری کیا حالت ہوئی۔ دل قابو میں نہ رہا، زمین پر گر پڑا اور دیر تک ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتا رہا۔ گانا کیا تھا، ایک کوئل کی کُوک تھی، بے ہڈی کا گلا تھا، جدھر موڑو مڑ جاتا تھا، کبھی زمین پر ہوتا، کبھی آسمان پر، کبھی برچھی چلاتا، کبھی ریتی سے دل ریتتا۔ ذرا دیر بعد میں سنبھلا تو فرش سے اٹھا اور ایک کرسی گھسیٹ سندر کے قریب آ بیٹھا۔ اس کے بعد سندر نے لکھنؤ کی ایک مشہور چیز شروع کی۔ ع

کانہاں نیند نہیں نینن میں مُرلیا پھر بجاؤ نا

وہ وہ برچھیاں چلائی ہیں۔ وہ وہ کچوکے دیے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ اس چیز کے ختم ہوتے ہی سُندر نے طبلے والی سپید پوش سانولی ناگن سے کہا کہ: ''چمیلی بائی! تم بھی ایک چیز سنادو پھر کھانے کا مرحلہ طے کیا جائے تا کہ بعد میں اطمینان سے راگ راگنیوں کا رنگ جمے۔'' کچھ نہ پوچھ چمیلی بائی نے کس درد بھری آواز اور چوٹیلے دل سے ع

موری سندیانہ جگاؤ راج گاری دوں گی

گایا ہے کچھ عرض نہیں کرسکتا۔ایں خانہ تمام آفتاب است۔دونوں کے گلے ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔فرق صرف اتنا تھا کہ سندر کو اپنے گلے پر قابو زیادہ تھا اور چمیلی کی آواز میں سوز و مستی اس درجے تھی کہ سنبھلنے نہ دیتی تھی۔

خیر، دسترخوان چنا گیا اور ہم دونوں کھانے میں شریک ہوئے۔چمیلی بائی پانی پلاتی رہیں، پہلے تو میں بی چمیلی کو محض ایک کنیزک سمجھے ہوئے تھا مگر اب ان کے جوہر دیکھ لیے تھے پھر ان کمالاتِ صوتی اور صوری پر لباس اور طبیعت کی سادگی نے سونے پر سہاگا ع

''سادی ادا بھی لاکھ بناوٹ سے خوب تھی''

جی چاہا کہ وہ خادمانہ حیثیت سے پانی پلائیں۔کئی مرتبہ کہا کہ تم بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شامل ہو جاؤ مگر وہ ادب سے معذرت کرتی رہیں۔آخر کار میں نے سندر سے درخواست کی کہ اگر نامناسب نہ ہو تو انھیں بھی شریک کر لیا جائے تاکہ بعد میں راگ و رنگ کی مجلس شروع ہونے میں تاخیر نہ ہو۔سندر نے چمیلی کا ہاتھ پکڑ کر دسترخوان پر بٹھا لیا اور کہا کہ جن کے حکم سے سرتابی میرے امکان سے باہر ہے۔ان کے حکم سے تم کیوں کر گزیر کرسکتی ہو۔''

چمیلی شرمائی ہوئی سندر کے پہلو میں بیٹھ گئی اور کھانے میں شریک ہوئیں مگر پانی پلانے کا ثواب ہاتھ سے جانے نہ دیا۔دسترخوان کا مذاق بالکل ہندوستانی تھا نہ کاٹھیاواڑی، کھچڑی تھی نہ موٹی موٹی گھی لگی ادھ پکی روٹیاں بلکہ وہی کچھ تھا جو اپنے یہاں ہوتا ہے اور آب و نمک شہادت تھے کہ باورچی کوئی لکھنؤ کا منجھا ہوا رکاب دار ہے۔بعد میں فواکہات آئے۔بمبئی کے آفس اور پائیری کے پہلو بہ پہلو بنارس کا لنگڑا اور لکھنؤ کا سفیدہ بھی اپنی اپنی شانِ لطافت کا فیضان کر رہے تھے۔دسترخوان زیادہ کیا گیا تو فنجانوں میں سبز چائے کے چند دور چلے۔

اس کے بعد پھر طبلہ ہارمونیم سنبھالا گیا۔صبح ہو گئی اور آنکھوں نے نہ جانا کہ نیند کسے کہتے ہیں، پیٹھ نے نہ جانا کہ بستر بھی کوئی شے ہے۔کمر نے نہ جانا کہ سہارے کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔میں کیا کہوں اور کیوں کہوں کہ کس مزے کی شب تھی اور کن مستیوں وہ کٹی بھیرویں پر مجلس کا

خاتمہ ہوا۔ ہلکا سا ناشتا لایا گیا۔ قدرے معدہ پوری کی گئی۔ سندر نے مسہری سنواری اور مجھ سے کہا کہ: ''آپ ذرا آرام فرمالیں۔'' چمیلی نے چادر اوڑھائی بٹن دبادیا گیا۔ بجلی کی روشنی رخصت ہوئی اور ساتھ ہی اس کے سندر اور چمیلی بھی۔ مَیں نے چند کروٹیں لیں اور سو گیا۔

جا اے خیالِ غیر کہ فرصت یہاں نہیں
ہیں جلوۂ نگار کی مہمانیوں میں ہم

☆☆☆☆☆

(۷)

حدیثِ زلف چشمِ یار سے پوچھ
درازی رات کی بیمار سے پوچھ

جی: ''مَیں سو گیا۔ رات کی شرر افشانیوں کے بعد فوراً ہی کوئی سو سکتا ہے، مَیں تو سو گیا۔ قتل گاہِ ناز میں اتنی دیر تک تیر اندازی کا جو نشانہ بنایا گیا ہو، اسے نیند آسکتی ہے تو مجھے بھی نیند آگئی۔ اُس بے چارے پر جو کیفیت گزری، اُسے آپ نیند سے تعبیر کرتے ہوں تو آپ ہی فرما دیجیے کہ مَیں سو گیا۔ مَیں بجز اس کے اور کیا عرض کر سکتا ہوں کہ جی ہاں کروٹیں بدلیں اور سو گیا۔ مجھے کیا علم تھا کہ ملا بار ہلس پر لا کر میرے زخموں پر نمک پاشی ہوگی اور بہ جائے تسکین دہی کے اضطراب میں تیزی پیدا کی جائے گی۔

دلِ بستمت بہ زلف و ندانستم ایں قدر
کز وے چنیں دراز شود گفتگوئے دل

(دل کو تری زلفوں کا اسیر کرتے ہوئے معلوم نہیں تھا کہ دل کا معاملہ اس قدر بڑھ جائے گا۔)

سندر نے تو رات غضب ہی کیا۔ عورت بن کر وہ ستم توڑے کہ توبہ بھلی اب تک میں دل کے خلاف جدو جہد کر رہا تھا۔ کوشش تھی کہ جس خیال نے تین دن سے چکرا رکھا ہے اسے کسی صورت سے دفع کروں مگر اب بات حد سے گزر چکی، دل قابو سے باہر ہو گیا۔

دل با خیالِ آں لبِ میگوں ز دست شد
اے عاقلاں کنارہ کہ دیوانہ مست شد

(دل اس لبِ میگوں کے خیال میں ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اے خردمندوں ہوشیار ہو جاؤ کہ دیوانہ مست ہو گیا ہے۔)

ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اب جی چاہتا کہ خیال اُدھر سے ہٹے۔ زخم اچھے ہوں اور بے کیف زندگی بسر ہو۔

ہو سکتی ہو جس زخم کی تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یارب اسے قسمت میں عدو کی

میری قسمت بھی کیسی ہیٹی نکلی۔ قتل میں بھی اس درجے بخل، سندر کو فی الواقع عورت ہی بنا دیا ہوتا تو کارکنانِ قضا و قدر کا کیا بگڑ جاتا مگر اب یہ خیال بھی فضول ہے۔ عورت ہو یا مرد ہمارے لیے یک ساں ہے۔ ہم تو بس مرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ہمیں صرف مرنے سے کام ہے۔ ؎

منم غلامِ محبت کرم بہائے منست
ہر آں کہ بندہ شارد خدائے منست

(مَیں محبت کا غلام ہوں مری قیمت مہربانی ہے۔ جو مجھے اپنا بندہ سمجھے وہی مرا خدا ہے۔)

لیکن یہ خیال دل میں کیوں پیدا ہوا کہ سندر عورت ہوتیں، رات کو ان سے کیوں فرمائش ہوئی کہ زنانہ لباس پہنیں، معلوم ہوتا ہے کہ دل میں چور ہے۔ نفسِ ملعون مملکتِ عشق میں شاید رخنہ اندازی کے درپے ہے۔ مَیں اس کا سر کچل ڈالوں گا۔ یہاں تذکر و تانیث سے بحث نہیں۔ ؎

در رہِ عشقش خرامِ دیگر است
سیر ایں منزل بگامِ دیگر است

(اس کے عشق میں ٹہلنا الگ بات ہے اور اس منزل کی سیر دوسری بات ہے۔)

تذکیر و تانیث کی بحث صفات سے متعلق ہے اور یہاں تو ذات سے سروکار ہے۔ ؎

نہ عارض نہ زلفِ دوتا دیکھتے ہیں
خدا جانے ہم تجھ میں کیا دیکھتے ہیں

کروٹیں پر کروٹیں لے آرہا ہوں۔ نہ نیند آتی ہے نہ اُٹھنے کی سکت پاتا ہوں کہ کسی کا نرم

ہاتھ شانے پر آیا۔ آنکھ کھول کر دیکھتا ہوں تو سندر کا کشیدہ قامت سرہانے پاتا ہوں۔ اس وقت کوٹ پتلون سے آراستہ ہیں۔ بال کچھ اس طرح سے ڈریس کیے ہوئے ہیں کہ مڈل ایجز (ازمنہ متوسطہ) کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔

مَیں: "آداب عرض ہے۔ آپ وہی رات والی سندر بائی، وہی کوکنے والی کوئل ہیں؟ اس وقت تو ملٹن بنے ہوئے ہیں۔

ہر لحظہ جمال خود نوعِ دگر آرائی
شورے دگر انگیزی شوقِ دگر افزائی

(ہر لحظہ اپنے حسن کو کسی اور طریقے سے سنوارا کر۔ حسن کا کچھ اور ہنگامہ اٹھا اور شوق بڑھا۔)

سندر: (ایک لطیف تبسم سے) "اس شاعری کو اس وقت ملتوی فرمایئے۔ دن کے گیارہ بج چکے ہیں۔ اُٹھیے، منہ ہاتھ دھویئے، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

مَیں اُٹھا، نام تو منہ ہاتھ دھونے کا تھا مگر سارا سامان غسل کا مہیا تھا۔ غسل کیا، جس سے طبیعت کو قدرے فرحت ہوئی اور کھانے پر آ کر بیٹھ گیا۔ یہ عجیب بات تھی کہ نہ رات کے کھانے پر کوئی ملازم تھا نہ اس وقت۔ سارا کام سندر اور چمیلی ہی نے کیا۔ ہم سب نے ساتھ کھانا کھایا۔ اس کے بعد چمیلی تو کھانے کے برتن لے کر رخصت ہوئیں اور سندر میرے پاس آ کر بیٹھ گئے۔

مَیں نے دیکھا کہ وہ کسی قدر سکوت میں ہیں۔ جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ یہ سکوت دیر تک قائم نہ رہا اور سلسلۂ گفتگو جلد شروع ہو گیا۔

سندر: اس وقت اس کمرے میں آپ کے اور میرے سوا کوئی نہیں۔ یہ محفل راز ہے۔ آپ اپنے حجابات کو دور فرما کر کچھ کہنا چاہتے ہوں تو کہیں۔ مَیں تین دن سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر بات زبان پر آ کر رک جاتی ہے۔ فرمایئے، بے تکلفی سے فرمایئے کہ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ اگر مجھ سے آپ کی کوئی خدمت ہو سکتی ہے تو مَیں اس کے لیے بسر و چشم حاضر ہوں۔ مَیں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کو فخر سمجھوں گا۔ بشرطے کہ میرے امکان میں ہو۔"

مَیں سکتے میں رہ گیا۔ یا اللہ! یہ مجھ سے کیا کہلوانا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال کس جانب منتقل

ہوا۔ اب تک جوان کا اثر مجھ پر پڑا ہے وہ میرے خیال کو کسی ایسی جانب نہیں پھیر سکتا نہ میری زبان سے کوئی رکیک فقرہ ان کے سامنے اور ان کی شان میں نکل سکتا ہے۔ ان کا اشارہ کس امر کی جانب ہے۔ میرا امتحان تو مقصود نہیں۔ اس وقت تخلیہ ہے، اس تخلیے میں یہ اپنے آپ کو میرے حوالے کر رہے ہیں مگر مجھ سے کیوں کر ممکن ہے کہ اپنے ضمیر اور ان کی شرافت کے خلاف کسی جسارت کا ارتکاب ہو، اتنا ضرور ہے کہ ان سے محبت ہو گئی ہے ان کا خیال دل کو مضطرب رکھتا ہے۔ ان سے جدائی شاق ہے۔ انھیں دیکھ کر تسکین ہوتی ہے پھر کیا یہ بات ان سے کہہ دوں اس سے بہتر اور کون سا موقعہ ہاتھ آئے گا۔

سندر: "فرمائیے، فرمائیے۔ آپ کو تامل کیوں ہے۔ یہ سوچ بچار کیسا؟ عرض کر چکا ہوں کہ بے تکلف فرمائیے۔ مَیں آپ کی زبانِ مبارک سے اس وقت آپ کے دل کی پوشیدہ باتیں سننے کا متمنی ہوں اور نہایت خندہ پیشانی سے آپ کے ہر گوارا اور ناگوار حکم کی تعمیل کے لیے حاضر مگر کچھ ارشاد بھی تو ہو۔"

مَیں: "حکم کی تعمیل آپ پر واجب نہیں، مجھ پر واجب ہے۔ مَیں حکم دینے کے لیے نہیں ہوں، حکم کی تعمیل کے لیے ہوں۔ میرے قلب کو آپ سے وہ تعلق ہو گیا ہے جسے لوگ محبت کے نام سے پکارتے ہیں۔ آپ کا خیال مجھے مضطرب رکھتا ہے۔ آپ کی مفارقت مجھے بے چین رکھتی ہے۔ آپ سامنے ہوتے ہیں تو عرض نہیں کر سکتا کہ میری کیا حالت ہوتی ہے۔ میرے ساتھ یہ معاملہ اس شدت سے کبھی پیش نہیں آیا۔ مجھے اب اپنی زندگی کچھ محال سی نظر آتی ہے۔ مَیں یہی سوچ رہا تھا کہ یہ آپ سے کہنے کی باتیں ہیں یا نہیں؟ تین دن سے یہ مرحلہ در پیش تھا مگر زبان یاری نہ دیتی تھی ع "کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ" آپ کی اجازت اور آپ کے جسارت دلانے سے ڈرتے ڈرتے اتنا کہا ہے۔ آگے زبان نہیں چلتی۔"

سندر: "ڈرتے ڈرتے اتنا کہا ہے اور آگے زبان نہیں چلتی تو گویا اس کے آگے بھی کچھ ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ مَیں لڑکا ہوں لڑکی ہوتی تو آپ کے کسی کام آتی پھر بحالتِ موجودہ آپ مجھ سے کس برتاؤ کے متوقع ہیں؟"

مَیں: "لاحول ولاقوۃ الا باللہِ العلی العظیم۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

جس بات کا مجھے اندیشہ تھا وہی پیش آئی نا، آپ جیسے سمجھ دار شخص کے سامنے بھی کیا اس کی ضرورت ہے کہ مَیں عشق پر ایک لیکچر دوں۔ آپ نے تو عشق و بہمیت میں کوئی امتیاز ہی نہ رکھا۔ مَیں نے جو خدمتِ والا میں عرض کیا تھا نرا اور نتھرا۔ صاف اور ستھرا عشق تھا۔ آپ نے جس عشق کی جانب اشارہ فرمایا ہے بہمیت ہے، ٹھیٹھ بہمیت۔ بندہ نواز! کجا نور کجا نار، بہمیت کو مَیں بمبئی کے مقاماتِ اسفل میں چھوڑ آیا۔ اُس وقت تو ملا بار ہلس کی بالائی سطح پر بیٹھا ہُوا اوپر کی ہواؤں کے لطف لے رہا ہوں۔ عشق ایک پاکیزہ چیز ہے۔ عرض کر چکا ہوں کہ آپ سے یہ پاکیزہ رشتہ رکھتا ہوں۔"

سندر: "عشق! عشق! اس قدر بھیانک! اس قدر ڈراؤنی چیز!"

مَیں: "اس قدر پُر لطف، اس قدر لذیذ۔ اس قدر شیریں، تلخیاں اس سے شیریں ہو جاتی ہیں۔ آنسو لذیذ بن جاتے ہیں۔ تکالیف مبدل بہ راحت ہو جاتی ہیں۔"

سندر: "تو پھر عشق آخر ہوا کیسے؟ اور کس چیز پر، کیا میرے گانے پر آپ عاشق ہو گئے؟"

مَیں: "نہیں گانے پر نہیں، بلکہ آپ پر، آپ کا گانا سننے سے قبل آپ پر عاشق تھا۔ یہ علم بھی نہ ہُوا تھا کہ اس فنِ لطیف میں آپ کو دست گاہِ کامل ہے کہ آپ پر عاشق ہو گیا تھا۔"

سندر: "تو کیا مجھے دیکھنے سے پہلے میری صورت پر نظر پڑنے سے قبل آپ مجھ پر عاشق تھے؟

مَیں: نہیں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ آپ کی صورت دیکھنے سے قبل آپ پر عاشق تھا۔"

سندر: "یہ تو فرمایئے کہ میری صورت پر آپ عاشق ہیں؟ فرمایئے میری صورت میں کون سی شے پسند آئی۔ میرا لانبے بال یا میرا بے ریش چہرہ؟"

مَیں: "فرض کیجیے کہ آپ کے لانبے بال یا بے ریش چہرہ ہی نے جذب کا یہ کام کیا ہو تو اس میں آپ کا کیا ہرج ہے؟

سندر: "تو ان بالوں کو ترشوا دیا جائے تا کہ آپ فارغ البال ہو جائیں۔"

مَیں: "اب ان بالوں کے ترشوانے سے بھی چھٹکارا مشکل ہے۔"

نظر بہ زلف و رُخ و خال نیست عاشق را
تو واقفی کہ سر رشتہ درکجا بند ست

(عاشق کی نظر زلف ورخ اور خال پر نہیں ہوتی تو جانتا ہے کہ اس کا تعلق کہاں سے ہوتا ہے۔)

سندر: آپ جانتے ہیں کہ مَیں لڑکا ہوں۔عورت نہیں، کل میرے داڑھی نکل آئی تو آپ کے یہ حضرتِ عشق کدھر تشریف لے جائیں گے یا خدانخواستہ چیچک میرے رخساروں کو بدزیب کر دے تو آپ کس کونے میں منہ چھپائیں گے اور یہ تو یقینی امر ہے کہ خدا نے مجھے عمر دی تو چہرے پر جھریاں پڑ جائیں گی، کمر خمیدہ ہو جائے گی بال سپید ہو جائیں گے۔منڈیا ہلنے لگی۔میری صورت مکروہ ہو گئی تو پھر آپ کا عشق کس راگ میں دُھرپت الاپے گا۔"

مَیں: "مَیں کہتا نہ تھا کہ مجھے آپ کے سامنے عشق پر ایک تقریر کرنے کی ضرورت ہے، جنابِ بندہ! عشق جب ہوتا ہے باطنی رعنائی کے ساتھ ہوتا ہے۔ظاہری رعنائی وہاں تک رسائی کا ذریعہ ہوتی ہے اس وقت بہیمت سے مجھے بحث نہیں۔ایک سنگِ مرمر کی مورت بنایئے، جس قدر حسین اور نازک آپ اس کو بنا سکتے ہوں بنائیں۔جس قدر اعلا درجے کے کپڑے اُسے پہنانا چاہیں پہنائیں۔مشین یا برقی قوت سے آپ اسے متحرک بھی کر دیں۔ناز انداز تک اس میں پیدا کر دیں گراموفونی پرزوں کو اس کے پیٹ کے اندر لگا کر گانے کی آواز بھی اس کے گلے سے نکالیں مگر کیا کوئی سلیم الطبع انسان ان کمالات کے باوجود اس پر عاشق ہو سکتا ہے۔ایک حُسین سے حُسین عورت کی نعش آپ کسی مَن چلے عاشق مزاج کے سامنے پیش کریں بجائے عاشق ہونے کے وہ اس سے ڈر کر بھاگے گا۔عشقِ باطنی رعنائی سے ہوتا ہے۔جب باطن ہی نہ ہوگا تو باطنی رعنائی کہاں سے آئے گی اور انسان کا باطن وہ روح ملکوتی ہے جو کالبدِ خاکی میں انّی جاعلٌ فی الارضِ خلیفة کے ساز کی ہم آہنگی میں پھونکی گئی اور جس کے پھونکتے ہی فرشتے اس پیکرِ خاکی کے آگے سجدے میں گر پڑے۔صرف جلوہ آرائی کے لیے کالبدِ خاکی کی ضرورت ہوئی۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

وہ فریفتہ اور گرویدہ کرنے والی باطنی موہنی اس وقت تعین سندر میں میرے پیشِ نظر ہے سندر کے لانبے اور بل کھائے ہوئے بالوں، چکنے اور چمکیلے گالوں، کٹیلی اور نشیلی آنکھوں نے وسیلہ

بن کر اُس باطنی معنی تک رسائی پیدا کردی ہے۔ اس رسائی کے بعد یہ عوارضات رہیں یا نہ رہیں، تعلق میں فرق نہیں آ سکتا۔ نکاح کے بعد دلالہ کی حاجت نہیں رہتی۔

چوں در آمد وصال را ہالہ
سرد شد گفتگوئے دلاّلہ

(جب وصال میں ہالہ آ گیا تو دلالہ کی گفتگو بھی سرد ہو گئی۔)

ان بالوں کو درمیان سے ہٹا دو، ان گالوں کو نظروں سے پوشیدہ کر دو۔ ان میٹھی میٹھی باتوں کو بحرِ سکوت میں گم کر دو۔ اور دیکھو کہ میرے قلبی لگاؤ میں کوئی فرق آتا ہے یا نہیں۔ تمھیں کوئی تدبیر آتی ہو تو اپنی صورت کا نقش میری یادداشت سے مٹا دو۔ میرے حافظہ کی نوٹ بک سے اسے محو کر دو اور جس صورت پر تمھیں ناز ہے ہے اُسے میری نگاہوں سے اوجھل کر دو پھر دیکھو کہ اس صورت سے بے تعلقی اختیار کر لینے کے بعد بھی میرا تصور باوجود تمھیں بے صورت متصور کرنے کے تم پر کس قدر شرر افشانیاں کرتا ہے۔ تمھاری رات کی نیندیں حرام کر دے گا۔ تمھارے دن کا چین ملیا میٹ کر دے گا۔

پڑا فلک کو کبھی دل جلوں سے کام نہیں
جلا کے خاک نہ کر دوں تو داغؔ نام نہیں

کمرے میں سناٹا چھا گیا خود مجھ پر میری اس تقریر کا اثر تھا۔ مَیں نہیں کہہ سکتا کہ میری زبان نے ان کلمات کو کیوں کر ادا کیا۔ اس مضمون سے مَیں نا آشنا تھا۔ مدت کی بات ہے کہ ایک کتاب میں یہ بحث نظر سے گزری تھی۔ اس وقت سمجھ میں خاک نہ آیا تھا لیکن پڑھتے وقت چوں کہ کسی قدر لطف آ گیا تھا۔ اس کے بعض بعض مقامات یوں ہی سے کچھ یاد رہ گئے تھے۔ اس وقت ایک حالت سی مجھ پر طاری ہوئی۔ الفاظ خود بخود میری زبان پر جاری ہو گئے اور مطلب دل میں اُتر آیا۔ معانی کا ایک ناپیدا کنار سمندر میرے سامنے موجیں مارنے لگا اور فہم وادراک جدید فتوحات نے مجھ میں مستی پیدا کر دی۔ جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی، سر میں گرانی محسوس ہونے لگی، قریب تھا کہ مَیں چکر کھا کر گرتا کہ یک بہ یک میری نظر سندر پر پڑی جو بے ہوش تھے۔ عجلت سے اٹھا، بجلی کا پنکھا رواں کیا۔ پانی

کے چھینٹے منہ پر دیے یہاں تک کہ انھوں نے آنکھیں کھولیں، چہرہ زرد تھا اور بدن پسینہ میں تر۔

مَیں: ''سندر کیسی طبیعت ہے؟''

سندر: ''اللہ کا فضل ہے۔ اس کا شکر ادا کرتا ہوں۔ مَیں نے آج اپنی مراد پالی۔ جس چیز کی تلاش تھی، مل گئی۔ میرے ہاں آج عید ہے۔ سال ہا سال کی الجھی ہوئی گتھی آج سلجھے گی۔ اس وقت نقاہت مجھے اٹھنے نہیں دیتی۔ ذرا سہارا دے کر اٹھایئے۔'' دروازے پر دستک ہوئی۔

سندر: ''کون۔ چمیلی؟''

چمیلی: جی حضور۔''

سندر: ''چلی آؤ۔''

چمیلی گھبرائی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

سندر: ''مجھے ذرا اندر لے چلو۔''

چمیلی: ''حضور خیر تو ہے؟ چہرہ کیسا اترا ہُوا ہے۔''

سندر: ''آج خیر نہ ہوگی تو کب خیر ہوگی۔ برسوں کے انتظار کے بعد تو خدا نے یہ دن دکھلایا۔''

چمیلی کے سہارے سندر اُٹھے اور چلے۔ دروازے پر پہنچے تو مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔'' مَیں چائے اور پان بھیجتا ہوں، اُن سے شغل کیجیے۔ میرا انتظار نہ فرمایئے۔ مَیں شاید پچیس تیس منٹ بعد حاضر ہوسکوں گا۔''

نیافتم کہ غضب بود مدعا یا لطف
مرا تبسم دوشنام ہر دو باہم سوخت

(معلوم نہیں۔ اُس کا مدعا غضب کا تھا اُس کی مہربانی۔ مجھے اس کے تبسم اور دشنام گوئی دونوں ہی نے جلایا۔)

☆☆☆☆☆

(۸)

محفلِ عیش ہو یا مجلسِ غم دونوں میں
شمع کو روتے پتنگوں کو تڑپتے گزری

کچھ عرصے تک تنہا چائے اور فواکہات سے الجھتا اور گزشتہ تین چار دن کے واقعات میں غوطے لگاتا رہا۔

می کنم فکرے کہ آں زلفِ دراز آید بدست
دست کوتہ دارم اما می کنم فکرے دراز

(سوچتا ہوں کہ اس کی زلف دراز کو پکڑلوں۔ مَیں ہاتھ کھینچ لیتا ہوں اور فکر کو دراز کر لیتا ہوں۔)

کہ تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا اور سندر تشریف لائے۔

سندر: ''مَیں کچھ عرض کرنے حاضر ہُوا ہوں۔''

مَیں: ''ارشاد۔''

سندر: ''میری بیوی آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔''

مَیں: ''آپ کی بیوی! ____ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں؟''

سندر: ''جی ہاں۔''

مَیں: ''کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے؟''

سندر: ''جی ہاں۔''

مَیں: ''کیا آپ کی بیوی ہم راہ ہیں؟''

سندر: ''جی ہاں۔''

مَیں: ''کیا خیر سے کوئی بچہ بھی ہے؟''

سندر: ''ابھی میں خود ہی بچہ ہوں۔''

مَیں: ''کیا بیگم صاحبہ لکھنؤ کی ہیں؟''

سندر: ''نہیں کاٹھیاواڑ کی۔''

مَیں: ''پھر آپ کی ان سے کیسے نبھتی ہوگی۔''

سندر: ''نہایت پُر لطف طریق سے۔کاٹھیاواڑ کی ہیں تو کیا ہُوا، تربیت ان کی بھی لکھنؤ کی ہے۔خوب ہیں اور مجھ سے ہر بات میں بڑھی چڑھی ہیں۔ارشاد ہوتو حاضر ہوں۔''

مَیں: سبحان اللہ! آپ تو گھوڑے پر سوار ہیں۔تشریف رکھیے، مجھے اپنی بیوی کے حالات سے مطلع تو کردیجیے۔یوں میں کس طرح ان سے مل سکتا ہوں۔مجھے تو اب تک آپ نے شادی شدہ ہونے کا علم ہی نہ تھا ورنہ یہ کیوں کر ممکن تھا کہ کل سے آپ کا مہمان ہوتا اور بھابی کو سلام تک نہ کہلا بھیجتا۔''

سندر مسکرائے اور بیٹھ گئے۔

مَیں: ماشااللہ آپ ایک بیوی بھی رکھتے ہیں۔''

پہلو میں میرے دفن دلِ داغ دار ہو
ننھا سا اک مزار کے اندر مزار ہو

تو آخر وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟''

سندر: ''بوجہ اس یگانگت کے جو مجھ میں اور آپ میں ہوگئی ہے۔''

مَیں: ''یہ تو فرمایئے کہ یہ نیک بخت خاتون کہاں کی ہیں؟ کب سے آپ کے نکاح میں ہیں؟ یہ کیوں کر آپ تک پہنچیں اور لکھنؤ کی تربیت ان تک کیوں کر پہنچیں؟''

سندر: وہ اور ہم ایک شہر کے رہنے والے ہیں۔ان کے والد اور میرے والد آپس میں دوست تھے اور دونوں میں بے حد شیریں تعلقات تھے۔ان کے والد میرے والد سے بھی مال و دولت اور جاہ و حشم میں بڑھے ہوئے تھے۔ہم دونوں بچپن کے گوئیاں ہیں، ساتھ کھیلتے ہیں اور ساتھ ہی پڑھا بھی ہے۔آپس میں بھی بے انتہا محبت ہے جب ان کی شادی کے دن آئے تو انھوں نے مجھے انتخاب کیا۔اُن کے والدین بھی رضامند ہوگئے صرف مَیں ہی وہ تنہا شخص ہوں جسے عذر تھا۔اس عذر کی بھی ایک وجہ تھی۔

میری زندگی کے ساتھ ایک راز وابستہ ہے جس سے میرے علاوہ بہت ہی کم لوگ واقف ہیں۔شرم کی بات ہے۔حیا دامن گیر ہوتی ہے مگر آپ سے اب اجنبیت نہیں رہی اس لیے عرض

کیے دیتا ہوں۔ مجھ میں ایک پیدائشی نقص ہے۔ بیوی کے حقوقِ زوجیت ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ برائے نام مرد ہوں۔ مَیں نے نہ چاہا کہ اس نیک بخت کی جوانی خاک میں ملے، اس کی زندگی برباد نہ ہو۔ چوں کہ ہم دونوں ساتھ کھیلے ہوئے تھے اور ہم میں آپس میں کوئی حجاب نہ تھا۔ مَیں اُس کے پاس گیا اور مَیں نے یہ راز اس پر ظاہر کر دیا۔ وہ نہ مانی، اسے مجھ سے محبت تھی، وہ میری جدائی گوارا نہ کرتی تھی۔ اُس نے کہا مَیں ایثار کرتی ہوں۔ مَیں لذّتِ جوانی کو تم پر سے قربان کرتی ہوں۔ مجھے قبول کر لو۔ ورنہ مَیں تم پر سے کلیۃً قربان ہو جاؤں گی اور اس دنیا کو خیر باد کہہ دوں گی۔ مَیں مجبور ہو گیا، مجھے نکاح کر لینا پڑا۔ اس کی نگاہیں آج تک میرے ساتھ ویسی ہی ہیں مگر مجھے اس کی جوانی پر ترس آتا ہے، اُس کی بہار کے دن یوں ہی گزر رہے ہیں۔ برائے نام میں اس کا شوہر اور وہ میری بیوی ہے مگر مَیں حلف اٹھاتا ہوں کہ وہ ناکتخدا ہے، وہ اچھوتی ہے، وہ ایک پاک فرشتہ ہے۔ جس طرح وہ مجھ پر سے قربان ہوئی۔ مَیں بھی اُس پر سے قربان ہونا چاہتا ہوں۔ آپ میرے دوست ہیں۔ مجھ سے یگانگت رکھتے ہیں۔ للہ میرے دل پر سے اس بارِ گراں کو ہلکا کیجیے۔ مجھ پر کرم اور میری بیوی پر رحم فرمائیے۔ میری آبرو رکھیے اور اس کی جوانی پر ترس کھائیے۔ یہ کہا اور سندر نے رونا شروع کر دیا۔ مجھ پر عجیب اثر تھا۔ مَیں دم بخود ہو گیا۔ دنیا بھی کیسے دھوکے کی ٹٹی ہے یہاں کی چیز کیسی غلط نما ہے۔ رات میں یہ خیال کر رہا تھا کہ اس گھر کے جملہ افراد کس لطف کی زندگی بسر کرتے ہوں گے آج معلوم ہوا کہ سب کے سب کانٹوں پر سوتے ہیں۔ دنیا! او مکّار دنیا تو کیوں فریب دے دے کر لوگوں کو اپنی طرف بلاتی ہے؟ تجھ میں بجز غلط کاریوں اور غلط نمائیوں کے بتا کہ کیا ہے؟

مَیں: ''سندر! میرے اچھے سندر! دیکھو روتے نہیں، اٹھو! یہاں آؤ میرے پاس بیٹھو، میری بات سنو۔ مَیں تمھارے لیے ہر قسم کے ایثار پر آمادہ ہوں۔ مَیں یہ نہ جانتا تھا کہ تمھاری زندگی اس قدر دکھیاری ہے۔ آنسو پوچھو، سسکیاں نہ بھرو، میرا کلیجہ منہ کو آتا ہے، بولو! منہ سے بولو! کیا چاہتے ہو؟ مَیں ہر طرح حاضر ہوں۔ میری بوٹیاں کام آئیں تو نوچ لے جاؤ۔ میرے خون کی ضرورت ہو تو طشت لے آؤ، مَیں اسے اپنے خون سے پُر کروں۔ میرے سر کٹانے پر کوئی بات موقوف ہو تو بتا

دو۔ مَیں وہاں جا کر اپنا سر نذر کر آؤں اور تم پر، نیز تمھاری پیاری بیوی پر نثار ہو جاؤں، بولو، بولو، جلدی بولو، مَیں کیا کروں؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟‘‘

سندر: ’’(سسکیاں بھر کر) مَیں کیا بولوں، مَیں کیا بتاؤں، آپ ہی کوئی تدبیر نکالیے۔‘‘

مَیں: ’’تمھارے علاج کا بندوبست کروں؟‘‘

سندر: ’’لاحاصل‘‘

مَیں: ’’آخر کچھ بولو بھی کہ مَیں کیا کروں۔ میری ایک بات پہلے سُن لو، مَیں متقی پرہیز گار ہونے کا دعوا نہیں کرتا، میری زندگی اب تک بہت بے باکانہ بسر ہوئی ہے مگر ان گذشتہ تین چار دن کے واقعات نے مجھے کسی قدر پرہیز گار ضرور بنا دیا ہے۔ تم نے، تمھاری صورت نے، سیرت نے، تمھارے اوصافِ حمیدہ نے مجھے پرہیز گار بنا دیا ہے، تمھاری اس وقت کی تقریر نے۔ میرے اس وقت کے انکشافات نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ مَیں نہیں چاہتا کہ خدا اور رسول کے حکم کے خلاف کوئی فعل مجھ سے سرزد ہو۔ مَیں نہیں چاہتا کہ سوسائٹی میں تم اور تمھاری بیوی نکّو بنیں۔ مَیں نہیں چاہتا کہ تمھارے ناموس کو میں بٹّہ لگاؤں، تمھارے جذبات کو صدمہ پہنچاؤں اور تمھاری شریف بیوی تمھاری مونس زندگی اور تم پر نثار ہونے والی بیوی کی عفت و عصمت کو میرے ذریعے کوئی صدمہ پہنچے۔ ان تمام باتوں کو سوچ کر جواب دو، مَیں تمھارے حکم کی تعمیل کے لیے حاضر ہوں۔‘‘

سندر: ’’جب آپ کا تعلق میرے ساتھ اُس منزل پر پہنچ چکا ہے۔ جہاں میرے لانبے بال اور چمکتے ہوئے رخسار بقول آپ کے رسائی نہیں پاتے تو میرا ناموس آپ کا ناموس ہے۔ میرے جذبات آپ کے جذبات ہیں اور میرا مونس زندگی آپ کا مونس زندگی ہے۔ یگانگت کو حقیقی یگانگت سمجھ کر برتیے۔ مسئلے کے سلجھاؤ میں مجھے اور میری کسی چیز کو آپ سدِّ راہ نہ ہونے دیں۔ رہی سوسائٹی تو سوسائٹی کو میں نے اب تک اپنے اور آپ کے درمیان نہیں آنے دیا۔ نہ مَیں آپ کے لیے سوسائٹی کا ممنون ہوں نہ آپ میرے لیے، پھر آپ سوسائٹی کو درمیان میں کیوں لاتے ہیں، ہاں خدا اور رسول کے احکام بلا شبہ واجب الاحترام ہیں تو اطمینان رکھیے کہ خدا اور رسول کی مرضی کے خلاف انشا اللہ کوئی بات نہ ہونے پائے گی۔ بس فیصلہ ہُوا آپ سے یہی بات منوانا تھی کہ خدا اور رسول کی منشا کے

مطابق آپ سے کوئی درخواست کی جائے تو اس کے مان لینے میں آپ کو کوئی عذر تو نہ ہوگا۔"

مَیں: "اس کے مان لینے پر مجبور ہوں مگر معلوم بھی تو ہو کہ آخر ایسی صورت ہے کون سی۔"

سندر: "یہ آپ کو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔ مَیں اب اپنی بیوی کو لاتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کے اور ان کے باہمی مشوروں سے یہ گتھی آج سلجھ جائے گی۔"

بجلی کی طرح سندر لال صاحب کمرے سے باہر نکلے اور پَل کے پَل بیوی کا ہاتھ پکڑے ہوئے آ گئے معلوم ہوتا تھا کہ باہر کہیں دروازے کے قریب ہی کھڑی تھیں۔

زاں غمزہ عزم دیں مکن تُرکا نہ قصد دیں مکن
تاراجِ جاں تلقیں مکن آں ہندوئے بے باک را

(اس غمزے سے دین کا ارادہ نہ کر اور نہ بچوں کی طرح ارادہ کر۔ اُس کافرِ بیباک کو جان لٹانے کی تلقین نہ کر۔)

☆☆☆☆☆

(۹)

چہ حسنت این کہ گر ہردم رخت را صد نظر بینم
ہنوزم آرزو باشد کہ یک بارِ دگر بینم

(تیرے حسن کی کیا بات ہے! تیرے رخ کو ہر ساعت ہزار بار دیکھتا ہوں۔ پھر بھی یہ آرزو رہتی ہے کہ ایک بار اور دیکھ لوں۔)

اللہ اکبر! اسے مَیں حسنِ انسانی کہوں یا حسنِ ملکوتی، شان دار حسن، مبہوت کر دینے والا حسن، مدہوش کر دینے والا حسن، جتنے الفاظ آپ کو میسر آئیں صَرف کر دیجیے۔ اس حسن کی سچّی تصویر آپ نہیں کھینچ سکیں گے۔

گر مصور صورتے آں دلستاں خواہد کشید
حیرتے دارم کہ نازش را چساں خواہد کشید

(اگر مصوِّر اُس محبوب کی تصویر بنائے تو مَیں سوچتا ہوں کہ اُس کے ناز و ادا کی کس طرح تصویر بنائے گا۔)

قریب تھا کہ مَیں غش کھا کر گرتا مگر سنبھل گیا۔مَیں نے اس پاکیزہ اور مقدس حسن کو دیکھا اور سندر کی بیان کردہ سرگزشت کو یاد کیا تو واقعی میری آنکھوں سے بھی آنسو ٹپک پڑے، اِدھر میری آنکھوں میں سیلاب آیا، اُدھر بیوی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے میرے سامنے آ کھڑے ہو گئے مگر نہ معلوم کیا تھا کہ دونوں میاں بیوی تھرتھرا رہے تھے۔مَیں تعظیماً کھڑا ہو گیا۔چاہتا تھا کہ جھک کر سلام کروں مگر کچھ سُدھ بدھ نہ رہی، ہوش جاتے رہے، قریب تھا کہ چیخ مار کر رو دیتا۔یا بے ہوش ہو کر گر پڑتا کہ سُندر کے ہونٹ جنبش میں آئے۔

سندر: ’’لیجیے حضور یہ میری منکوحہ ہیں۔میری دیوی ہیں۔بچپن سے مَیں ان پر نثار ہوں اور یہ مجھ پر ،تمام عمر انھیں پوجا ہے، ان کی پرستش کی ہے، اب یہ آپ کی نذر ہیں۔‘‘

یہ کہہ کر سندر رو دیے، منہ پھیر لیا اور چلے گئے۔مجھ پر سکتے کا سا عالم طاری ہو گیا۔مَیں بھی تھرتھرانے لگا، چاہتا تھا کہ سندر کو پکاروں مگر آواز نہ نکلتی تھی۔مَیں تو مبہوت کھڑا ہوا تھا اور وہ آفتابِ حسن زرق برق لباس آراستہ میرے قدموں میں پڑا ہوا روتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا۔’’میرے آقا، میرے سوامی، میرے مالک، میرے دیوتا، میرے سب کچھ، بہت انتظار کرایا، بہت تڑپایا، بہت رلایا۔میں برسوں سے تمھارے انتظار میں تھی۔مدت سے تمھارے نام کی مالا جپ رہی تھی، تم کہاں تھے؟ اپنی کنیز کو کیوں فراموش کیے ہوئے تھے۔کب سے تمھارے لیے در بہ در خاک بسر پھر رہی ہوں۔تمھارے نقشِ کفِ پا پر سجدے کرتی پھرتی ہوں اور تم ہو کہ مجھے اب بھی نہیں پہچانتے۔مَیں نے اپنا سب کچھ تم پر سے قربان کر دیا۔اپنا دین و ایمان تک تمھاری نذر کر دیا اور تم ہو کہ بات تک نہیں کرتے۔بُت بنے کھڑے ہو۔‘‘

مَیں: ’’یہ تم کیا کہہ رہی ہو، میرے لیے تو یہ سب کچھ معمّا ہے، اُٹھو! خدا کے لیے اُٹھو۔دل کو تھامو، اس کرسی پر آ کر بیٹھو اور ٹھنڈے جی سے مجھ سے باتیں کرو۔‘‘ اُٹھیں اور اٹھ کر سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

مَیں: ’’تمھارے شوہر کہاں ہیں؟ انھیں تو بلاؤ، ان کے سامنے باتیں ہوں تو بہتر ہے۔‘‘

وہ: ”میرے شوہر تو تمھیں ہو۔ اب میں کسے بلاؤ، مَیں تو روزِ ازل سے تمھارے ہی لیے ہوں اور تم میرے لیے، جنھیں تم میرا شوہر کہتے ہو، وہ تمھارے ہی لیے میری حفاظت و خدمت پر غیب سے مامور تھے۔ وہ نہ ہوتے تو مَیں تم تک نہ پہنچتی، نہ صبر و استقلال سے تمھارا انتظار کرسکتی۔ کسی اور کے حوالے ہوگئی ہوتی۔ ان کے ہونے نے مجھے اغیار سے بچا لیا۔ اور تمھاری چیز کو تم تک سلامتی سے پہنچا دیا۔ تم نے انھیں دل دیا، اچھا کیا۔ وہ دل انھوں نے تمھارے حوالے کر دیا، جس طرح ان کے توسل سے میری رسائی تم تک اور تمھاری رسائی مجھ تک ہوئی۔ اسی طرح ان کے توسل سے دلوں کی حوالگی بھی عمل میں آئی ہے۔ تمھارا اُن کا معاملہ تو بس چار ہی دن سے ہے مگر میرا تمھارا معاملہ مدت العمر سے ہے۔ تمھارے نزدیک وہ تمھارے کام میں چار دن سے ہیں، میرے علم میں وہ تمھارے کام میں اوّل دن سے ہیں۔“

مَیں: ”مَیں اس چیستان کو مطلق نہیں سمجھا۔“

وہ: ”تمھارے، تمھارے نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔ واقعات کہیں اپنی صورت چھپا سکتے ہیں؟ حقیقت کور باطنی اور گریز سے مسخ ہوسکتی ہے؟ آگ کو آگ نہ سمجھنے سے اس کی حقیقت بدل سکتی ہے؟ دریا کو خشکی سمجھ کر اس پر چلا جاسکتا ہے؟ میرے تمھارے درمیان جو معاملہ ہے وہ ایسا نہیں جسے بڑی سے بڑی دنیاوی طاقت بھی مٹا سکے۔ صدق اور یقین کی قوت میرا سہارا ہے۔ اسی قوت نے مجھے اَب تک سنبھالا ہے۔ اور یہی قوت میری کشتی کو پار لگائے گی۔ خیالاتِ خام کو جانے دو۔ تخیلات فاسدہ کو دل سے دور کردو۔ گوش ہوش سے میر سنو۔ بس اپنی کتھا تمھیں سناتی ہوں میرا قصہ نہایت عجیب و غریب ہے۔ ایسے واقعات تم نے دنیا میں بہت کم سُنے ہوں گے۔ ذرا دم لے لو۔ سستا لو۔ پان کھالو۔ اور میری رام کہانی سننے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

ابھی کھل جائے گا عقدہ کسی کے رازِ پنہاں کا
ذرا بخیہ ادھڑ جائے مرے چاکِ گریباں کا

☆☆☆☆☆

(۱۰)

مژدگانے کہ مرا یار سوئے خویش کشید
دست در گردنِ من کرد مرا پیش کند

(مبارک ہو۔ مجھے یار نے اپنی طرف کھینچا اور میری گردن میں ہاتھ ڈال کر اپنی طرف کھینچا۔)

کمرے میں پھر سکوت چھا گیا۔ انھوں نے ہاتھ بڑھا کر گلاس اٹھایا۔ اور پانی کے تین گھونٹ لیے۔ پان میری طرف بڑھایا اور خود کھایا۔ پھر آنکھیں بند کر کے تھوڑی دیر تک کچھ غور فرماتی رہیں۔

درِ رہِ مہر جفا اے ظالم
ایں پس و پیش چہ معنی دارد

(اے ظالم! مہر و وفا کی راہ میں یہ پس و پیس کیا معنی رکھتا ہے۔)

اس چار دن کے اندر دماغ پر پے در پے اس قدر جھٹکے پڑے ہیں کہ بے چارہ بیکار سا ہو گیا اور میں نے اب اس سے کام لینا ہی چھوڑ دیا۔ انھوں نے جن کا نام ابھی تک مجھے معلوم نہیں ہوا۔ آنکھیں کھولیں۔ میری طرف دیکھا۔ ایک انگڑائی لی۔ کرسی پر سنبھل کر بیٹھیں۔ اور یوں تقریر شروع کی۔

"ہندوستان کے ایک دور افتادہ گوشہ میں مرکزی آبادیوں سے ہٹی ہوئی ایک گمنام سی ریاست ہے۔ جہاں چند ہی روز ہوئے کہ ایک راجہ صاحب حکمران تھے۔ ان کے ایک لائق اور وفادار وزیر بھی تھے جن کی وہ بہت قدر و منزلت کرتے تھے۔ دونوں میں محبت و یگانگت بے انتہا تھی۔ ریاست میں خوش حالی خوش انتظامی اور برکت تھی۔ زمانہ کے تاریک تمدن سے وہ خطہ کا خطہ پاک تھا۔ راجہ اور وزیر اطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ہر اعتبار سے خوش و خرم نظر آتے تھے اگر غم تھا تو یہی کہ اولاد سے دونوں محروم تھے۔ راجا صاحب کو اس کا اکثر ملال رہتا تھا۔ وزیر صاحب کے سامنے وہ کبھی کبھی اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ ایک دن وزیر نے کہا کہ:

"اپنی ریاست کے کسی جنگل میں ایک پہاڑی غار ہے جس میں کوئی مہاتمان پُرش آئے

ہوئے ہیں جو رات دن بھگتی میں مصروف رہتے ہیں اور کسی سے غرض واسطہ نہیں رکھتے۔ ان کی طرف رجوع کیا جائے تو شاید کوئی مفید نتیجہ مرتب ہو۔ راجا صاحب ان سادھوؤں جوگیوں کے قائل نہ تھے۔ انھوں نے چند مکار جوگیوں کے ایسے چھل فریب دیکھے تھے کہ وہ تمام فرقے سے بدظن ہو گئے تھے۔ اس لیے انھوں نے اس تجویز کی طرف کچھ التفات نہ کیا مگر وزیر صاحب نے ان مہاتمان کے کچھ ایسے حالات سُن لیے تھے کہ معتقد ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ آخر وزیر صاحب نے اس مسئلے کو بارہا چھیڑ کر راجا صاحب کو رضامند کر ہی لیا کہ مہاتما جی کے درشن کو کسی دن حاضر ہوں۔ چناں چہ شبھ گھڑی دیکھ کر ایک دن دونوں کے دونوں ان کے درشن کو روانہ ہوئے۔ درشن کرتے ہی راجا صاحب تو سوامی جی پر ایسے لٹو ہوئے کہ ہفتے میں دو بار ان کے چرنوں میں حاضر ہونے لگے۔ رشی جی بہت بوڑھے آدمی تھے، کہیں جاتے آتے نہ تھے مگر راجا جی پر ان کی کرپا اتنی بڑھی کہ ایک روز بن بلائے راجا جی کے محل میں آن پدھارے۔ راجا باغ باغ ہو گئے۔ رشی جی ایک ہفتے کامل محل میں رہے۔ ایک روز موقع پا کر راجا جی نے ان کے چرن پکڑ لیے اور رو رو کر پرارتھنا کی کہ ”اس ٹہنی میں اب تک کوئی پھل نہیں آیا، بھگوان کے پیارے ہو، کچھ دیا ہو جائے۔“

رشی جی پہلے کچھ دیر تک آنکھیں بند کیے بیٹھے رہے، اس کے بعد بولے:

”ہائے دنیا میں کوئی سکھی نہیں، پرمیشور نے تم کو راج دیا، دھن دیا، استریاں دیں، تن درستی دی، عزت و آب رو دی، محبت اور تابع داری کرنے والی رعیّت دی، خیر خواہ اور نمک حلال ملازم اور کارندے دیے مگر اس مٹھاس میں تھوڑی سی کڑواہٹ بھی ملا دی، جس سے تمھارا سارا عیش کرکرا ہو گیا۔ یہ ہے وہ مایا، جس کے پیچھے ہزاروں لاکھوں آدمی اپنی کروڑوں پدموں برس کی زندگی کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ کسی کو پرمیشور نے پتر دیے ہیں تو اُسے فکر ہے کہ ان کا پیٹ کہاں سے پالے، کسی کو دھن دیا ہے تو نہ پیٹ ہے نہ پتر، جن پر وہ دھن کام میں لایا جائے، کسی کو دھن اور پتر دونوں ملے ہیں تو روگ پیچھے لگا دیے ہیں۔ مصیبتوں اور پریشانیوں کی ایک فوج کھڑی کر دی ہے اور حسرتوں سے بھری ہوئی یہ زندگی ہے، جس میں آدم زاد کو تھوڑے دنوں کے لیے قید کر دیا گیا ہے مگر گیان ہو تو پتا چلے کہ اس کڑواہٹ میں بھی ایک مٹھاس ہے اور ان حسرتوں کے

کانٹوں میں بھی کام یابی کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ سچ پوچھو تو دکھی کوئی بھی نہیں۔ پرمیشور کا ایک نام ہے ارحم الراحمین۔ وہ مَن موہن ہے۔ پریم کا ساگر ہے۔ دَیا کی برکھارت ہے۔ ماتا پتا سے زیادہ اور بہت زیادہ مہربان ہے۔ اس کا کوئی کام رحم سے خالی نہیں۔ اُس کی ہر کڑواہٹ میں ایک مٹھاس ہے۔ اس کی کرپا اچھوں اور بُروں کو اپنی اپنی گود میں اُٹھائے پھرتی ہے۔ راجا جی! تم تو بڑے اچھے لوگ ہو۔ بھگوان کی کرپا سے تمھیں وزیر بھی بڑے بُدھیمان اور سوچ بچار والے مِلے ہیں۔ مَیں تم دونوں سے پوچھتا ہوں، سچ بتانا، بھلا تمھارے مَن میں کبھی یہ وِچار بھی پیدا ہوا ہے کہ پرمیشور نے تم پر کتنے بڑے بڑے احسان کیے ہیں؟ تمھیں اپنی ریاست میں اپنے علاوہ کوئی ایک شخص بھی ایسا نظر آتا ہے، جس کو تم سے بڑا بنایا گیا ہو جو تمھاری طرح ایک ریاست کا راجا یا اپنے راجا کا وزیر ہو؟ جسے دھن دولت تم سے زیادہ مِلی ہو؟ اقبال میں تم سے بڑھا ہُوا ہو؟ جس کی رکشا میں اتنے لوگ زندگی بسر کرتے ہوں اور جس کے لبوں کی مسکراہٹ اور تیوری کے بَل پر لوگوں کی خوشی اور غم کروٹیں بدلتے رہتے ہوں؟ تم ان مہربانیوں کی گنتی نہیں کر سکتے جو پرمیشور نے تم پر برسائی ہیں، پھر تم مجھے بتاؤ کہ خدا کی ان مہربانیوں کا تم نے کیا شکریہ ادا کیا ہے جو اور زیادہ مہربانیوں کے لیے تم ہاتھ پھیلا رہے ہو۔ سچ بتاؤ کہ خدا کی ان بے شمار عنایات پر کیا اسی قوّت کے ساتھ تمھارے دل میں جذباتِ شکرگزاری جوش مارا کرتے ہیں جس قوّت کے ساتھ اولاد نہ ہونے کا غم تمھیں ستاتا ہے؟ کیا مَیں غلط کہتا ہوں کہ لوگوں کے خوف اور دنیا کے ڈر سے تم زبان سے چاہے کچھ نہ کہتے ہو مگر دل میں تمھارے شکایت اُٹھتی رہتی ہے کہ ایشور کا برتاؤ تمھارے ساتھ اچھا نہیں۔ ایک کانٹے کے چبھنے سے تم پھولوں کی خوش بو سے ناک بند کیے لیتے ہو۔ تم خیال کرتے ہو کہ اولاد کا نہ ہونا تمھارے حق میں ایک بہت بڑی مصیبت ہے حال آں کہ تمھیں خوب تجربہ ہے کہ بعض کے حق میں اولاد کا ہونا ایک مصیبت ثابت ہوتا ہے۔ تمھیں کیوں کر یہ اطمینان ہو گیا کہ تمھارے حق میں اولاد مصیبت ثابت نہ ہوگی۔ تمھیں کیا حق حاصل ہے اس نتیجے پر آنے کا کہ تمھارے محل میں اولاد کا پیدا نہ ہونا ایک کوتاہی ہے جو ایشور تمھارے ساتھ کر رہا ہے، کبھی ان کوتاہیوں کا بھی تم نے شمار کیا ہے جو دن رات تمھارے ہاتھوں پرمیشور کی شان میں ہوتی رہتی

ہیں۔ مَیں نے مانا کہ اس زمانے میں تم بہت غنیمت بلکہ بہت بھلے لوگ ہو مگر راجا جی! سچی بات تو یہ ہے کہ اس کلجگ، اس دورِ ظلمات کے اثر سے تم بھی محفوظ نہیں۔

مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں کہ تم عیسائی ہو وہ یا یہودی، ہندو ہو یا مسلمان، تم سب کے سب ایک ہی کشتی پر سوار ہو۔ تمھاری کشتی کے پیندے میں ایک نہیں بلکہ کئی سوراخ ہو گئے ہیں، جن میں سے ہلاکت کا پانی اندر آ رہا ہے اور تمھاری بربادی کا سامان تمھاری غفلت سے مہیّا ہو رہا ہے۔ چندے اور بے اتفاقی رہی تو پھر تمھاری نجات کی کوئی صورت نہیں۔ اگر تم یہودی ہو تو اپنی کتابِ مقدس کو تم نے پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ اپنے برگزیدہ پیغمبر کی برگزیدہ تعلیم سے روگردانی کر رکھی ہے اور اپنے خدا سے تم نے بغاوت پر کمر باندھ رکھی اگر تم عیسائی ہو تو اپنے مذہب کا تم نے خود ہی مضحکہ اڑانا شروع کر دیا ہے۔ اپنی اصل انجیل مقدس کو تم نے ناقص اور اور گم راہ کن ترجموں میں گم کر دیا ہے۔ اپنی مذہبی تعلیم کو تم نے ڈپلومیسی کے میدان میں دفع الوقتی اور مصلحتِ ملکی کی ٹھوکروں سے پامال کر ڈالا ہے۔ عیسٰی مسیح کی تعلیم اور ان کے فقر و ایثار و تواضع کی تم نے اپنی ملّی اور ملکی زندگی میں ایسی بھونڈی اور مبتذل تصویر کھینچی ہے کہ اس وقت دنیا تم پر ہنس رہی ہے۔ اپنے خام فلسفے اور ناقص سائنس کے بل بوتے پر تم نے بزعمِ خود اپنے مذہب کی متبرک کتابوں کو تم نے لا علمی اور کج فہمی کے صندوقوں میں بند رکھا ہے۔ اپنی قدیم شان دار مذہبی روایات کو بوستان خیال اور الف لیلا کے قصّوں کی سطح لا گرایا ہے۔ رسم ورواج کی پابندی کو دھرم سمجھ رکھا ہے۔ ظاہری لکیروں کے فقیر بن گئے ہو، شاخوں میں جھومتے ہو، جڑ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے، چھلکے سے واسطہ رکھتے ہو، سفر تک رسائی نہیں پاتے، شہد کے چھتّے تک ہاتھ لے جاتے ہو مگر شہد کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ درمیانی منزلوں میں الجھ کر رہ جاتے ہو مگر انتہائی منزل تک نظر بھی نہیں لے جاتے۔ ظاہری صفائی اور ذات پات کا اس درجے خیال رکھتے ہو کہ اغیار کی نگاہ میں تم ایک تماشا بن گئے ہو لیکن حقیقی صفائی اور سچی پاک باطنی سے کوسوں دور ہو، موکش اور نجات سے تم لوگ بھی اتنی ہی دور ہو جتنی کہ تمھارے نزدیک ملکش اور ادھرمی لوگ ہیں۔

اگر تم مسلمان ہو تو بجز اِس کے اسلام کو بدنام کرنے کے کوئی اور کارِ نمایاں تم سے سرزد نہیں

ہوتا،تم نے اپنے قرآن پاک کی تعلیم سے استغنا برتنا شروع کردیا ہے۔اپنے رسول پاک کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چھوڑ دیا ہے۔اپنے مذہب کی دینی و دنیوی تعلیمات پر عمل کرنا اور انھیں اپنے لیے نتیجہ خیز بنانا تم اپنی طاقت سے باہر سمجھنے لگے ہو، دائمی اور غیر فانی مفاد کو تم نے چندروزہ اور فانی الذات کے ہاتھ فروخت کرنا شروع کردیا ہے۔آج کل تو تمھاری ایک جماعت نے مذہب کو پالیٹکس کی دکان پر گرو کرڈالا ہے بجائے اس کے کہ پالیٹکس کو تم مذہب کا جزو سمجھو عملاً مذہب کو تم نے پالیٹکس کا جزو قرار دے لیا ہے۔مشرکوں اور بت پرستوں پر ہنستے ہو مگر تمھاری خود یہ کیفیت ہے کہ ہر موسم میں اپنے لیے نئے نئے بت تراشتے ہو اور چندروز ان کی پرستش کر کے انھیں معزول کردیتے ہو یعنی بت پرستی میں بھی دوسری اقوام کی سی ثابت قدمی اور استقامت نہیں دکھاتے۔لوگوں کو یہ کہنے کا موقع دیتے ہو بلکہ تم خود بھی یہ کہتے ہو کہ ''مسلمانان در گور و مسلمانی در کتاب'' اگلے زمانے کے مسلمان اگر قبروں سے نکل کر آجاویں تو تمھارے ساتھ وہ معاملہ جائز رکھیں جو وہ کفار کے ساتھ جائز رکھتے تھے۔یہ تو تمھارا حال ہے اور گستاخیاں تمھاری اس درجے بڑھ رہی ہیں کہ کبھی جنابِ باری تعالیٰ کی بارگاہ میں شکوہ ہے اور کبھی دربارِ رسالت میں شکایت۔

اگر حقیقت اسلام در جہاں ایں است
ہزار خندۂ کفر است بر مسلمانی

(اگر جہاں میں اسلام کی حقیقت یہی ہے تو تو کفر اسلام پر ہزار بار ہنسے گا۔)

مَیں یہ نہیں کہتا کہ تم سب ایسے ہو،تم میں مستثنیات ضرور ہیں اور مستثنیات نہ ہوں تو اس کائنات کا شیرازہ درہم برہم ہو جائے مگر مستثنیات کا وقوع عمومیت کے وجود کو توڑنے کے لیے کافی نہیں مستثنیات کو چھوڑ کر تم سب کے سب نکتۂ اصلی سے ہٹے ہوئے ہو۔

راجا جی:''مہاراج! آپ کی اس وقت کی تقریر نے تو ہمیں چکر میں ڈال دیا،جس دن سے آپ کے درشن نصیب ہوئے ہیں،ہمارا دل برابر آپ کی جانب کھنچ رہا ہے مگر اب تک ہم آپ کو پورے طور پر پہچان نہ سکے۔کبھی ہمیں آپ کے متعلق گمان ہوا کہ آپ ہندو ہیں اور کبھی یہ کہ آپ مسلمان ہیں اور کبھی یہ کہ آپ نہ ہندو ہیں نہ مسلمان۔وزیر جی سے بھی بارہا یہ گفتگو رہی،جب مَیں یہ کہتا کہ

رشی جی کے اصلی مذہب کا پتا نہیں چلتا تو وزیر جی یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیا کرتے کہ فقیر کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔'' لیکن میرے دل کو اس سے کبھی اطمینان نہ ہوا۔ آپ کی آج کی باتیں اس معاملے میں مجھے پھر چکر میں ڈالتی ہیں، کرپا کیجیے اور ذرا پردہ اُٹھائیے کہ آپ کا اصلی مذہب کیا ہے؟

رشی جی: ''تمھارے اس سوال کا میرے پاس بجز اس کے کوئی جواب نہیں کہ مَیں دیوانہ ہوں اپنے پرمیشور، اپنے بھگوان، اپنے گاڈ، اپنے کریٹر، اپنے پروردگار، اپنے پالن ہار، اپنی رکشا کرنے والے، اپنے خدا اور اپنے اللہ کا۔ ؎

بنامِ آں کہ او نالے ندارد

بہر نامے کہ خوانی سر برآرد

(وہ جو کوئی نام نہیں رکھتا، اگر اسے کسی بھی نام سے پکارو، وہ متوجہ ہوگا۔)

غرض کہ اپنے اس پریم پتی، اس پریم پربھو کے عشق میں دیوانہ ہوں ؎

نہ ہندوم نہ مسلماں نہ کافرم نہ یہود

بحیرتم کہ سرانجام من چہ خواہد بود

(مَیں ہندو ہوں نہ مسلمان، کافر ہوں نہ یہودی۔ حیرت میں ہوں کہ میرا کیا انجام ہوگا۔)

کفر و اسلام کے جھگڑوں سے پاک ہوں، مذہب و ملت کے قصّوں سے آزاد ہوں۔ ذات پات کی الجھنوں سے دور ہوں۔ یہ فرق و امتیاز سب نیچے کی باتیں ہیں۔ مَیں اس وقت ان سب باتوں سے ارفع و اعلا ہوں۔ عشق کا بندہ ہوں، پریم کا پجاری ہوں۔ ؎

ملّتِ عشق از ہمہ ملت جدا ست

عاشقاں را مذہب و ملّت خدا ست

(عشق کی ملّت ساری ملت سے جدا ہے۔ عاشقوں کا مذہب و ملّت خدا ہے۔)

اسی ایک کو جانتا ہوں۔ اسی ایک کو مانتا ہوں۔ اسی ایک کو دیکھتا ہوں۔ اسی ایک سے لو لگی ہے۔ اسی ایک میں مَیں نے اپنی وہمی ہستی کو گم کر دیا ہے۔ تم کہتے ہو گے کہ یہ پاگلوں کی سی بکواس ہے۔ یہ مجنونوں کی سی بے معنی گفتگو کیسی۔ مگر میں اس جنون کے قربان۔ اس نے مجھے

ہلاکت کی جانب رہ نمائی کرنے والے سراب سے روک لیا۔

فارغ از دغدغۂ گبرو مسلماں کردی
اے جنوں گردِ تو گردم عجب احساں کردی

(مجھے تو نے آتش پرست اور مسلمان کی پریشانی سے آزاد کردیا ہے۔ اے جنوں ترا طواف کروں کہ تو نے مجھ پر عجب احسان کیا ہے۔)

سنو! ذرا دھیان دے کر سنو، آتما کی سیوا دین ہے۔ شریر کی سیوا دنیا ہے۔ جب شریر کی سیوا سے منشا یہ ہو کہ شریر کو آتما کی سہائتہ اور خدمت کے قابل بنایا جائے تو شریر کی سیوا بھی آتما ہی کی سیوا بن کر دین میں داخل ہو جاتی ہے آتما اور شریر کے میل سے جو شخصیت قائم ہوتی ہے وہ دین کی بھی محتاج ہے اور دنیا کی بھی مگر جب وہ شخصیت وہی ثابت ہو کر ایک عظیم الشان حقیقی ہستی میں فنا ہو جاتی ہے۔ جب قطرہ سمندر سے مل کر سمندر نہیں رہتا، جب دوئی مٹ جاتی ہے، جب مجاز کا پردہ اُٹھ جاتا ہے، جب توہّمات کے بادل درمیان سے ہٹ کر مطلع صاف کر دیتے ہیں اور حقیقت اپنا چہرۂ زیبا دکھلا کر لطف وعنایات ورحمت وشفقت کی آغوش کو پھیلا دیتی ہے تو تم ہی بتاؤ کہ دین و دنیا کی وہاں کیا گزر ہو سکتی ہے۔

لبِ دریا ہمہ کفر است و دریا جملہ دین داری
ولیکن گوہرِ دریا ورائے کفر و دیں باشد

(دریا کے کنارے پر سارا کفر ہے اور خود دریا سارا دین داری ہے لیکن دریا کا گوہر کفر اور دین سے جدا ہوتا ہے۔)

کام یاب وہی ہیں جو گوہرِ مقصود کو اپنا نصب العین قرار دیے ہوئے ہیں اور یوں تو ہر اوپر کی منزل کا شخص اپنے سے نیچی منزل والے کو گم راہ اور منزل سے بھٹکا ہوا سمجھتا ہے۔

زائرِ کعبہ را مقیم درت
کافرِ سومنات می گوید

(کعبے کے زائر کو تر ادر کا مقیم سومنات کا کافر کہہ رہا ہے۔)

جن کی آنکھیں حقیقت بینی کے نور سے روشن ہیں اور جن پر آفتابِ قدس نے اپنی چمک ڈال دی ہے۔ انھیں یہ نظر آتا ہے کہ:

جملہ یک نور است اما رنگ ہائے مختلف
اختلافِ درمیانِ این و آں انداختہ

(تمام نور ایک ہی ہے البتہ مختلف رنگوں نے این و آں کے درمیان فرق ڈال دیا ہے۔)

دنیا میں سب سے زیادہ ملن سار اور صلحِ کل اور تعصب سے مبرّا تم ہم لوگوں کی جماعت کو پاؤ گے۔ دنیا میں امن عامّہ قائم رکھنے اور اقوام مختلفہ کے باہمی تعلقات میں شیرینی پیدا کرنے میں ہمارا ہی مذہب کچھ کار آمد ہو سکتا ہے۔ ہم اختلافاتِ ظاہر کی مختلف نمائیوں کی حقیقت سے آگاہ ہیں۔ مختلف اقوام میں مابہ الاشتراک چیز کو ہم جانتے ہیں۔ ہم پر ہر دم ہر ساعت منکشف ہوتا رہتا ہے کہ: ؎

عاشق ہو عشق و محبت و بُت گر و عیار یکیست
کعبہ و دیر و مساجد ہمہ جا یار یکیست

(عاشق، عشق، محبت، صنم گر اور عیار سب ایک ہی ہیں۔ کعبہ، بت خانہ اور مساجد ہر جگہ ایک ہی محبوب ہے۔)

ہم لوگ اہلِ عشق ہیں۔ اس عشق کے گرداب میں جب ہم سے ہمارا ہی امتیاز اٹھ جاتا ہے تو دوسروں اور دوسروں کے باہمی اختلافات کا ہمیں کیوں کر ہوش رہ سکتا ہے۔ ؎

ما ہمہ بندۂ عشقیم، ولے اہلِ تمیز
کعبہ و شیخ و بت و برہمنے ساختہ اند (مظہر)

(ہم تو سب عشق ہی کے بندے ہیں مگر فرق کرنے والوں نے کعبہ، شیخ، بت اور برہمن بنا دیے ہیں۔)

راجا جی! تم پنڈتوں کے چکر سے نکلو۔ گیانیوں کے کنڈل میں آکر بیٹھو تو تمھیں پتا لگے کہ اصلیت کیا اور سچ تو یہ ہے کہ جنھیں تم پنڈت سمجھے ہوئے ہو وہ دراصل پنڈت نہیں ہیں بلکہ پستکوں سے لدے ہوئے بیل ہیں ان کو پنڈت سمجھنا تمھاری بھول ہے۔

پوتھی سب تھوتھی بھئی پنڈت بھیا نہ کوئے
ڈھائی اچھر پریم کے پڑھے سو پنڈت ہوئے

پریم! پریم! کتنی پیاری، کتنی ان مول، کتنی رسیلی نشیلی اور پُر لطف چیز ہے۔ درد و محبت کی کہانیاں جب اتنی دل چسپ اور جاذب ہوتی ہیں کہ انھیں نام چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تو اصلی چیز میں کیا کچھ برقی اثرات نہ ہوتے ہوں گے۔

عشق را دردے بباید پردہ سوز
گاہ جاں را پردہ درگہ پردہ دوز
عشق مغزِ کائنات آمد مدام
لیک عشق آمد ز بے دردے تمام
قدسیاں را عشق ہست و درد نیست
درد را جز آدمی در خور نیست
ہر کر اور عشق محکم شد قدم
در گذشت از کفر و از اسلام ہم
(عطاؔر)

عشق سوئے فقر در بکشایدت
فقر سوئے کفر رہ بنمایدت
عشق را با کافری خویشی بود
کافری خود عین درویشی بود
چوں ترا ایں کفر و ایں ایمان نماند
ایں تن تو گم شدہ و ایں جاں نماند
بعد ازیں مردے شوی ایں کار را
مرد باید ایں چنیں اسرار را

پائے ورنہ ہم چو مرداں دم ترس
درگذر از کفر و از ایماں ترس
چند ترسی دست از طفلی بدار
باز شو چوں شیرِ مرداں در شکار

(عشق کو پردہ جلانے والا درد چاہیے۔کبھی جان کا پردہ اور کبھی پردہ سینے والا۔عشق کائنات کا مغز ہے۔مگر عشق بڑا ظالم ہے۔فرشتوں کو عشق ہے لیکن درد نہیں ہے۔آدمی کے سوا اور کوئی درد کے لائق نہیں ہے۔جس کے قدم بھی عشق میں محکم ہو گئے۔وہ کفر اور اسلام دونوں سے آگے نکل گیا۔

(عشق ترا دروازہ فقر کی طرف کھولتا ہے۔فقر تجھے کفر کی طرف راہ دکھاتا ہے۔عشق کی کافری سے رشتے داری ہے اور کافری خود عین درویشی ہے۔جب تجھ میں کفر اور ایماں نہ رہا تو پھر ترا جسم اور تری جاں بھی نہ رہی۔اس کے بعد تُو اس کام میں مرد ہو جائے گا اور ان اسرار کے لیے مرد ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔کب تک ڈرے گا بچپنے کو چھوڑ دے اور شیروں کی طرح شکار کر۔)

راجا جی: مہاراج! آپ نے اس وقت مجھ پر بجلی گرا دی۔میرے تن من میں ایک آگ لگا دی۔ مَیں اولاد کی پرارتھنا کو واپس لیتا ہوں اب نہ مجھے اولاد کی اِچھا ہے نہ دھن کی، نہ حکومت کی، میرا دل چاہتا ہے کہ راج پاٹ سے ہاتھ اُٹھالوں اور سنیاس لے کر باقی عمر آپ کی سیوا میں گزار دوں۔ رشی جی! مجھے اب اس کال کوٹھری سے نکال کر پریم کے بھمنڈال کی تازہ ہوا کھلائے۔"

وزیر جی: "مہاراج! میری بھی یہی آرزو ہے، ایک مدت سے میرا دل اس بے وفا دنیا سے سرد پڑ چکا ہے، میرے دل میں اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ یہ جوش پیدا ہوا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کسی جنگل کی طرف نکل جاؤں مگر شرافت، وضع داری اور نمک حلالی کی زنجیروں نے مجھے اپنے آقا سے جدا نہ

ہونے دیا، اب جب کہ میرے آقا خود سنیاس لے رہے ہیں تو میں ایسا نمک حرام نہیں کہ ایسے وقت میں ان کا ساتھ چھوڑ دوں۔"

رشی جی: "نہیں نہیں، یہ مناسب نہیں، خدا نے اس دنیا میں جن ذمّے داریوں کو تم پر عائد کیا ہے، ان سے بھاگنا مردانگی کے خلاف ہے۔ بزدل اور پست ہمت مت بنو، مردانہ وار میدان میں بڑھو۔ راج پاٹ کا کام سنبھالو، بیوی بچوں کا حق ادا کرو، کنبے رشتے داروں کی سیوا کرو، رعیت کی رکشا کرو، دوست آشناؤں کے ساتھ نیکی کرو اور ساتھ ہی ساتھ روحانی کمالات بھی پیدا کرو تا کہ حقِ زندگی ادا ہو۔ خدا کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ تم انسانیت سے خارج ہو کر ترقی کرو بلکہ اس نے تمھیں اس دنیا میں اس لیے بھیجا ہے کہ انسانیت کے دائرے میں محدود رہ کر اس کے حسبِ مرضی ترقی کرو۔ صحیح اور اصلی ترقی وہی ہے جو خدا کے مقرر کردہ پروگرام کے مطابق ہو۔ تم دونوں کے اس وقت کے ذوق وشوق سے مجھے بے انتہا مسرت ہوئی۔ خدا استقامت عطا فرمائے اور اپنی بارگاہ میں تم دونوں کو قبول کرے۔

راجا جی! مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ تم نے بہت تھوڑی ہی سی دیر میں اپنے دل کو دنیا کی آلائشوں سے پاک کر ڈالا، یہاں تک کہ اولاد کی تمنا کو بھی دل سے دور کر دیا۔ خوش رہو، سلامت رہو، دل کو دنیا سے بے تعلق کر لینا ہی ترکِ دنیا ہے۔ اور اسی کو دل کی پاکی اور صفائی کہتے ہیں۔ جب دل پاک وصاف ہو جاتا ہے تو دنیاوی مشاغل سے اصلی کام میں خلل واقع نہیں ہوتا۔ "دل بہ یار، دست بکار" کے مقولے کو پیشِ نظر رکھو، تم نے عمر بھر کی تمنا یعنی خواہشِ اولاد کو جو اس وقت ایک ٹھوکر سے توڑ دیا اس کا صلہ اب تمھیں یہ ملتا ہے کہ مَیں تمھیں اس خوش خبری کے سنانے پر مامور ہوں کہ تم ایک نہیں بلکہ کئی بھاگوان بچوں کے باپ بنو گے، جاؤ! اپنے محل میں جا کر یہ خوش خبری سنا آؤ۔

گر مرادِ خویش خواہی نامرادی پیشہ گیر
بامرادِ خویش را در نامرادی یافتیم

(اگر مراد چاہتا ہے تو ناامید ہو جا۔ ہماری مرادیں اس ناامیدی سے بر آئیں۔)

وزیر جی! تم کو بھی یہی خوش خبری دیتا ہوں۔ صبر اور زبان پر اس آرزو کے نہ لانے کا یہ تمھیں انعام ہے۔ تم بھی اپنے گھر اس خوش خبری کو سنا آؤ۔

سات دن پورے ہونے پر رشی جی اپنے استھان کو واپس جانے لگے تو راجا اور وزیر سے رخصت ہوتے وقت فرمایا۔ بظاہر میں تمھارے پاس سے جا رہا ہوں لیکن دراصل میں تم سے جدا نہیں ہوتا، مجھے اپنے سے جدا تصور نہ کرنا۔ ع

دستِ پیر از غائباں کوتاہ نیست

(پیر کا ہاتھ دور رہنے والوں مریدوں سے دور نہیں ہوتا۔)

اور جو باتیں مَیں نے کہہ دی ہیں انھیں دھیان میں رکھنا، اپنے اصلی کام میں مستعد رہنا اور دنیا کے کسی رنج و غم کو پاس نہ پھٹکنے دینا۔ تم دونوں کی کچھ امانتیں میرے سپرد ہیں اور ان امانتوں کے بارے سبک دوش ہو جاؤں اور تمھارے بچوں کو تمھاری گود میں کھیلتا ہوا دیکھ لوں تو ہنسی خوشی اور اطمینان سے پرلوک کو سِدھاروں۔

راجا اور وزیر دونوں متفق اور ہم آواز ہو کر بولے۔ مہاراج آپ کی کرپا سے سب کام سدھ ہو جائیں گے۔ پرمیشور آپ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔"

اس کے بعد راجا اور وزیر میں عجیب و غریب تغیرات واقع ہوئے، جن کا علم صرف خاص ہی لوگوں کو ہے۔ مگر اتنا سب جانتے ہیں کہ اس دن سے دونوں کے دونوں رشی جی درشن کو روز بلا ناغہ جانے لگے۔ سال ختم نہ ہونے پایا کہ دونوں کے گھر اولاد ہوئی۔ راجا کے گھر یہ پاپن پیدا ہوئی اور وزیر کے گھر آپ کے محبوب آپ کے دل بر میاں سندر۔ میرے متعدد نام ہیں۔ شیریں، جوزا فائن، پاروتی، بلقیس لیکن اب آپ جس نام سے مجھے پکاریں وہی میرا اصلی اور سچا نام ہوگا۔ رشی جی نے پتا جی کو اطمینان دلایا کہ لڑکی ہونے پر ملول نہ ہونا یہ لڑکی بہت بھاگوان ہے۔ اس کے بعد بھگوان کی کرپا سے لڑکا ہوگا جو تمھاری گدی کا وارث بنے گا۔ نہایت بلند اقبال ہوگا اور اس کے عہد میں تمھاری ریاست خوب پھیلے گی اور پھولے گی۔ میرا مونڈن جسے عقیقہ کہتے ہیں۔ رشی جی کی گود میں ہوا۔ میری بسم اللہ انھیں کے مبارک ہاتھوں ہوئی، اُنھیں نے مجھے لکھایا پڑھایا، یوگ وِدیا اور اسلامی تصوف کی کچھ باتیں بتائیں، درویشی کے چند مشاغل تعلیم کیے۔ جنھیں میں اب تک کرتی ہوں۔ باتوں ہی باتوں میں تعلیم کے بڑے بڑے مرحلے طے کر دیے۔ والد کو انھوں نے خاص طور

پر ہدایت فرمائی تھی کہ میری تربیت ہندوستانی ہو۔ اس میں کچھ مصلحت ہے، چناں چہ ابتدا ہی سے مری تربیت کے لیے دہلی اور لکھنؤ سے مختلف فنون کی جاننے والی مستورات طلب کی گئیں اور مَیں انھیں میں رکھی گئی۔ سندر کے ساتھ بھی رشی جی کا یہی برتاؤ رہا اور میری طرح ان کی تربیت بھی دہلی اور لکھنؤ والوں کے ہاتھ رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دونوں میں آپ اس قدر ہندوستانیت پاتے ہیں۔

اس کے بعد میری شادی کا مسئلہ پیش آیا، سندر اور مَیں ہم عمر۔ ساتھ کے کھیلے اور ساتھ کے بڑھے تو تھے ہی۔ ہم دونوں میں کچھ محبت بھی غیر معمولی تھی۔ ایک دوسرے کی نگاہ سے اوجھل ہوتا تو دنیا تاریک ہو جاتی مگر رشی جی نے بھی والد کو یہی مشورہ دیا کہ ہندوانہ طریق سے ہم دونوں کا وِداہ کر دینا چاہیے۔ سندر نے انکار کیا تو رشی جی نے انھیں بلا کر سمجھا دیا۔ یہاں تک کہ ہم دونوں میں شادی ہو گئی۔ اپنی شادی پر مجھے نہ افسوس ہوا نہ حیرت ہوئی۔ کیوں کہ رشی جی نے شادی سے پہلے میرے کان میں کچھ کہہ دیا تھا۔ بڑوں کی مصلحتیں بڑے ہی خوب سمجھتے ہیں۔ مَیں بالکل قانع رہی اور خوش وخرم۔ حتیٰ کہ نہ اپنوں کو کچھ پتا چلا نہ پرایوں کو۔ اس شادی کو سال بھر گزرا ہوگا کہ رشی جی پھر ہمارے محلوں میں آ کر مہمان ہوئے اور اس مرتبہ دو مہینے مہمان رہے۔ سندر سے جو جوان کے معاملات رہے وہ تو آپ سندر ہی سے سنیے گا۔ مجھ پر ان کی عنایات اس زمانے میں بے شمار رہیں۔ مجھے انھوں نے بڑی بڑی باتیں سمجھائیں۔ میری زندگی کے متعلق بہت کچھ خبریں دیں۔ بہت سی نصیحتیں کیں۔ بہت سی ہدایات لکھ کر مجھے دے گئے۔ بہت سی باتیں لکھ کر لفافوں میں بند کر کے میرے حوالے کر گئے اور ان لفافوں پر لکھ گئے کہ اسے فلاں موقع پر کھولنا اور اسے فلاں موقع پر۔ انھیں نے مجھے آپ کا پتا دیا۔ انھیں نے مجھے یہ بتایا کہ مَیں آپ کے لیے ہوں اور آپ میرے لیے۔ آپ ہی کی خاطر میری تربیت ہندوستانی ہوئی اور میری خاطر سندر ہندوستانی بنائے گئے۔ سندر کے ساتھ میرا وِداہ اس لیے تھا کہ مَیں آپ کے لیے محفوظ رہوں۔ وقتِ مقررہ سے پہلے آپ مجھے مل نہیں سکتے تھے۔ آپ کے فراق میں مَیں نے بہت صدمے اُٹھائے۔ بڑی بڑی مصیبتیں جھیلیں۔ آپ کی صورت میری آنکھوں میں پھرتی رہیں۔ رشی جی سے مَیں نے ایک دن عرض کیا تھا کہ آپ کا حلیہ مجھے معلوم ہو جائے۔ انھوں نے فرمایا:

''بیٹی! آج ہی رات کو انھیں خواب میں دیکھ لینا۔'' چناں چہ اسی رات سپنے میں مَیں نے آپ کے درشن کر لیے اور اسی وقت سے آپ کی پجارن بن گئی۔ جب سے اب تک برابر آپ ہی کی مالا جپ رہی ہوں۔ آپ کی بہت سی خوبیاں رشی جی نے مجھ سے بیان کیں، وہ خوبیاں جو ابھی تک آپ کو بھی معلوم نہیں اور جن کا ظہور آگے چل کر ہونے والا ہے۔ انھوں نے آپ کے بہت سے حالات لکھ کر مجھے دے دیے تھے۔ چنا چہ وہ اب تک میرے پاس محفوظ ہیں۔ رشی جی کا جب وصال ہونے لگا تو انھوں نے آپ کو سلام بھی کہا تھا اور کہا تھا کہ یہ پیغام میری طرف سے انھیں پہنچا دینا کہ مَیں اپنا کھلونا تمھارے سپرد کرتا ہوں۔ اسے سنبھال کر رکھنا۔ میرے والدین کا بھی انتقال ہو گیا اور سندر کے والدین کا بھی۔ میرا چھوٹا بھائی اب ریاست کی گدی پر ہے اور سندر کا چھوٹا بھائی وزارت کے لیے تیار ہو رہا ہے۔ کیوں کہ سندر کو تو تھیٹر اور طبلے ہارمونیم ہی سے فرصت نہیں۔ ریاست کا کام آج کل ایک ایڈمنسٹریٹر چلا رہا ہے۔ میرے گزارے کے لیے ابا نے معقول جاگیر خالصہ کر دی ہے۔ اس کی آمدنی میرے پاس برابر آتی رہتی ہے۔ سندر کے نام بھی ایک معقول جاگیر ہے۔ اِن اموات کے ہو جانے سے میرا جی ریاست میں گھبرانے لگا اور آپ کی تلاش میں پردیس نکل کھڑی ہوئی۔ اس سفر میں جیسی کچھ تکلیفیں اُٹھائی ہیں ان کے سننے کی آپ تاب نہ لا سکیں گے۔ دو سال سے بمبئی میں ہوں۔ رشی جی کے کہنے کے مطابق مجھے یقین تھا کہ میری مراد اس شہر میں ضرور حاصل ہو گی۔ صرف تاریخ کا انتظار تھا، جس کاغذ میں میرے اور آپ کے ملاپ کی باتیں تھیں۔ وہ اس لفافے میں بند تھا جس کے کھولنے کی تاریخ آج سے چار ہی دن پیش تر کی تھی، چناں چہ مَیں نے سب حالات پڑھتے ہی سندر کو آپ کی تلاش میں بھیجا اور وہ کام یاب ہوئے۔''

بلقیس نے تقریر کو اس مقام تک پہنچا کر سکوت کیا۔ اپنے گلے میں سے پھولوں کا ایک ہار اُتار کر مجھے پہنا دیا اور سر سے پیر تک نہایت خاموشی سے ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھنا شروع کر دیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بے حس و حرکت تصویریں ہیں جو آمنے سامنے رکھی ہیں۔ بلقیس اپنے پیدائش کے قبل سے لے کر اس وقت تک کے عجیب و غریب حالات اس لطافت و روانی سے بیان کر گئیں کہ مَیں تصویرِ حیرت بن گیا۔

تمام بود بیک حرفِ گرم و ما غافل
حکایتے کہ ہمہ ناتمام می گفتند

(ساری بات اس ایک حرفِ گرم میں تھی جس سے ہم غافل تھے۔وہ حکایت جسے وہ نامکمل کہہ رہے تھے۔)

چند لمحوں کے معنی خیز سکوت کے بعد انھوں نے اپنا سلسلۂ کلام پھر جاری کیا۔

بلقیس: ''آج آپ کے اور میرے نکاح کی تاریخ ہے۔منظوری اور نامنظوری کے متعلق آپ سے سوال کرنالا حاصل ہے۔رشیوں کا لکھا جھوٹ نہیں ہوتا۔پہلے عرض کر چکی ہوں کہ صدق ویقین کی قوت سے میں اب تک اُڑتی رہی اور اسی قوت سے آئندہ بھی اڑوں گی۔ چناں چہ آپ سے اجازت لیے بغیر مَیں نے آج شب کو نکاح خوانی کا انتظام کر لیا ہے لیکن چوں کہ آپ میرے آقا ہیں آپ سے براہِ راست اجازت حاصل کرنا بھی میرے لیے سعادت کا باعث ہوگا، فرمایئے۔اجازت ہے یا نہیں؟''

مَیں: ''بلقیس تمھاری قوتِ گویائی اور تمھارے اندازِ بیان اور ان واقعات کے عجیب وغریب ہونے نے میرے دل ودماغ میں اتنی قوت ہی نہیں رکھی کہ زباں سے انکار نکلے۔

قلم ودوات و کاغذ ہمہ جمع کرد نرگس
کہ بہ پیشِ چشمِ مستت خطِ بندگی نویسد

(قلم،دوات اور کاغذ نرگس نے جمع کر لیے تھے تا کہ تری مست آنکھ کو بندگی کا خط لکھے۔)

مگر یہ تو بتاؤ کہ سندر بے چارے کا کیا حشر ہوگا۔ مجھے تو اس پر ترس آ رہا ہے اور کلیجہ شق ہوا جاتا ہے۔''

بلقیس: ''نہیں،سندر پر آپ ترس نہ کھائیں،کلیجہ شق نہ ہونے دیں۔وہ آپ کے معشوق ہیں اور میرے محسن،اب ان کا دوہرا حق ہے،وہ ہم سے کیوں جدا ہو سکتے ہیں بلکہ پہلے سندر پھر ہم،نام تو ان کا کچھ اور ہی لیکن جب آپ نے انھیں سندر کہا تو ہم بھی انھیں سندر ہی کہیں گے تو پھر ہے اجازت؟مَیں جا کر نکاح خوانی کے انتظام کو مکمل کر آؤں؟

مَیں: ''بسم اللہ! اب اس کارِ خیر میں استخارہ کی کیا حاجت، کیا میری شامت آئی ہے جو آپ کے صدق ویقین کی قوت سے مقابلہ کروں اور رشی جی کی روح کو صدمہ پہنچاؤں، بھلا رشیوں کے لکھے کو مَیں غلط کر سکتا ہوں۔''

بلقیس: ''تو ایک گزارش اور ہے۔ اس وقت چار نکاح ہوں گے۔''

مَیں: ''ماشااللہ، یہ چار کن کن کے؟''

بلقیس: ''آپ کے۔''

مَیں: ''چاروں میرے؟''

بلقیس: جی ہاں، آپ کے۔''

مَیں: ''یک مشت۔''

بلقیس: ''(مسکرا کر) جی یک مشت، قصّہ یہ ہے کہ میری ایک بہنیلی اور دو سہیلیاں ہیں، جنھوں نے میری وجہ سے بڑی بڑی تکلیفیں اُٹھائی ہیں، یہ میری راز دار ہیں اور انھوں نے اپنی زندگیاں مجھ پر سے قربان کر دی ہیں۔ ان کی وفاداریوں نے مجھے مول لے لیا۔ ایک دن جوشِ احسان مندی سے مغلوب ہو کر مَیں نے انھیں قول دے دیا کہ تم تینوں کو مَیں تحفے میں اپنے آقا کی خدمت میں پیش کروں گی۔ تم تینوں کا ان سے نکاح پڑھاؤں گی اور جب تک تم تینوں سے سیج آباد نہ ہولے، مَیں ان کے نزدیک نہ جاؤں گی، اس قول کے پورا کرنے کا دن خدا نے آج دکھایا''

مَیں ذرا متأمل ہوا تو بلقس نے کہا: ''آپ سوچتے کیا ہیں؟ مَیں آپ کے معاملے میں کوئی کام رشی جی ہدایت کے خلاف نہیں کرتی۔''

مَیں: ''رشی کا نام بار بار لے کر مجھے ڈراتی کیوں ہو؟ مَیں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ آج مجھ میں انکار کی قوت ہی نہیں۔

ما جاں فدائے خنجرِ تسلیم کردہ ایم
خواہی بخش خواہ بکش رائے رائے تست

(ہم نے خنجرِ تسلیم پر جان فدا کر دی ہے۔ اب تری مرضی چاہے تو بخش دے یا جان لے لے)

بلقیس: "مَیں آپ کی عنایت کی ممنون ہوں۔ آپ نے میری بات رکھ لی، خدا میرے اور آپ کے ایثار کی قدر فرمائے وہ جو میری بہنیلی ہیں ان کا نام شاہ جہاں ہے۔ آپ سے استدعا ہے کہ انھیں اور مجھے ہم رتبہ سمجھیں۔ بڑے گھرانے کی لڑکی ہے اور بڑی خوبیوں والی ہے۔ آپ دیکھیں گے تو بہت پسند فرمائیں گے بلکہ اس کے مقابلے میں تو مَیں خود ہی اپنی ہی آنکھوں میں ماند پڑ جاتی ہوں اور دو سہیلیاں جو ہیں ان میں سے ایک کا نام نور جہاں اور دوسری کا بدر منیر ہے۔ یہ بھی ہمارے ہی کنبے کی لڑکیاں ہیں۔ ان کی خوبیاں بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اب مَیں جاتی ہوں۔ اس وقت سندر بھی عدیم الفرصت ہوں گے۔ شاید آپ کی خدمت میں فی الحال حاضر نہ ہو سکیں۔ مَیں اپنے سفر کی ڈائری چھوڑے جاتی ہوں۔ وہی سفر جو آپ کی تلاش میں کیا تھا۔ اس سے جی بہلا یئے گا۔ شاید کچھ دل چسپی کا باعث ہو۔ رشی جی کے لکھے ہوئے چند کاغذات بھی میز پر رکھے جاتی ہوں۔ امید ہے انھیں آپ ضرور پڑھیں گے۔ آج کا اخبار بھی بھیجتی ہوں۔ صرف دو گھنٹے کے لیے آپ سے رخصت ہوتی ہوں۔"

تا کہ نشد از وطلبِ طالبِ او کسے نشد
ایں ہم جستجوئے ماہست ز جستجوئے او

(اُس کی طلب کے بغیر کوئی اس کا طالب نہیں ہوا۔ ہماری تمام جستجو اُسی کی جستجو کے سبب ہے۔

☆☆☆☆☆

(۱۱)

چو عاشق می شدم گفتم کہ بردم گوہرِ مقصود
ندانستم کہ ایں دریا چہ موجِ بے کراں دارد

(جب مَیں عاشق ہُوا تو سمجھا کہ مَیں نے گوہرِ مقصود پالیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ دریا کیسی بھپری ہوئی موجیں رکھتا ہے۔)

بلقیس تو اپنے نکاح کے اہتمام میں ہوں گی۔ سندر بھی غالباً انھیں کا ہاتھ بٹا رہے ہوں گے مگر مَیں ہوں کہ تنہا اس کمرے میں بیٹھا ہُوا کبھی سمندر پر نظر ڈالتا ہوں، کبھی باغ کو دیکھتا ہوں، کبھی ڈائری کی ورق گردانی کرتا ہوں، کبھی میز پر رکھے کاغذات اُٹھاتا ہوں اور رکھ دیتا ہوں اور ایک گہرے سکوت میں چلا جاتا ہوں۔ سندر کی بیوی اور مجھ سے نکاح۔ واقعات متعلقہ عجیب وغریب، جملہ معاملات طے شدہ۔ یہ مَیں کس چکر میں آ گیا، مانا کہ سندر کی خوشی بھی اسی میں ہے بلکہ ان کی کوشش ہی یہ تھی مگر ہیں تو وہ سندر کی منکوحہ۔ دنیا تو انھیں اسی رشتے سے جانتی ہے۔ میری آنکھیں سندر سے چار کیوں کر ہوں گی، مجھے تو ان کے سامنے آتے شرم آئے گی۔ اُس وقت کی تنہائی اور اِس تنہائی میں دل سے یہ باتیں میرے لیے عذاب ہو گئیں۔ جب دماغ ہی بیکار ہو گیا ہے تو ان امور میں کیوں الجھتا ہے۔ میری زیست کو کیوں تلخ کر رہا ہے۔ فکرِ فردا سے مجھے کیوں جھنجھوڑ رہا ہے۔

بخود یک لحظہ بودن صد خطر در آستیں دارد
خدا اجرے دہد مے را کہ بے ما می کند مارا

(ایک ساعت بھی اپنے ساتھ ہونا، آستین میں سیکڑوں خطرے رکھتا ہے۔ خدا شراب کو اجر دے کہ اُس نے ہمیں بے خود کر دیا۔)

اس وقت سندر اور بلقیس دونوں کی صورتیں میری آنکھوں میں پھر رہی ہیں۔ قوت ممیّزہ میری کند ہو گئی۔ میں امتیاز نہیں کر سکتا کہ دونوں میں زیادہ حسین کون ہے۔ کمالات ایک کے تو کسی حد تک دیکھ چکا ہوں اور دوسرے کے کسی حد تک سُن چکا ہوں۔ دونوں میں محبت باہمی غایت درجے کی ہے، گویا غیریت ہی نہیں۔ انھیں ایک جان دو قالب کہا جائے تو بجا ہے پھر ان دونوں کا

ایک ہی دائرے میں رکھ کرانھیں اپنے عشق کا حدِ نظر بنالیا جائے تو اس میں قابلِ اعتراض بات ہی کون سی ہے۔ محبوب کا محبوب بھی تو آخر محبوب ہی ہوتا ہے۔ یہ قصہ پیش نہ آتا تب بھی تو مجھے دونوں کی ناز برداری کرنا پڑتی۔ ہاں خوب یاد آیا، رات سندر اس شعر کو کس قدر مزے لے لے کر الاپ رہے تھے۔ ؎

حسنِ روئے ہر پری روے زحسنِ روئے اوست
آبِ حسنِ دلبری ہر سو رواں از جوئے اوست

(ہر پری چہرے کا حُسن اسی کے حُسن سے ہے۔ دل بری کے حُسن کا آب اسی کے دریا سے جاری ہے۔)

سچ ہے۔ اس وقت رات کے اس شعر کا لطف آرہا ہے، یکے بعد دیگرے پردے اُٹھ رہے ہیں اور عجیب وغریب رموز کا انکشاف ہورہا ہے۔ جن سندر کے لانبے بال اور خوب صورت گال کا عدم و وجود میری قلبی کیفیات کے لیے یک ساں ہے تو اس تعددِ ظاہر کا میری نیاز مندی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ ؎

حسن نے ناز کیے عشق کی تکمیل ہوئی
نہ نظر آپ کی سمجھی نہ مرا دل سمجھا

مگر اس مسئلے پر خاموشی بہ تر ہے۔ ع

خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

(خاموشی وہ معنی رکھتی ہے جو گویائی میں نہیں ہوتے۔)

ان باتوں کی تشریح فضول ہے سمجھانے سے یہ سمجھ میں نہیں آتیں، جب تک سر پر پڑتی نہیں، آنکھیں نہیں کھلتیں، جب تک بچہ بالغ نہیں ہوتا۔ بالغ ہونے کی لذّت سے نا آشنا رہتا ہے۔ ؎

بہ دردِ عشق بساز و خموش شو حافظؔ
رموزِ عشق مکن فاش پیش اہلِ عقول

(اے حافظؔ! عشق کے درد سے موافقت پیدا کر اور خاموش ہو جا۔ عشق کے راز کو عاقلوں کے سامنے فاش نہ کر۔)

آفتاب غروب ہونے میں ذرا کسر تھی کہ بلقیس جہاں کمرے سے تو مَیں آج انکار ہی کر چکا تھا۔ اُٹھا اور غسل کیا، غسل کے بعد جوڑا آیا۔ حکمًا پہنا گیا۔ دیسی زرق برق لباس تھا جسے پہن کر اچھا خاصا شہزادہ بن گیا۔ کپڑے چمیلی نے پہنائے پھولوں کا ہاری بھی انھیں ہاتھوں سے گلے میں پڑا۔ کچھ دیر تک میں پھر کمرے میں تنہا ٹہلتا رہا کہ بی چمیلی آئیں اور کہنے لگیں۔

''چلیے طلبی ہے۔''

مَیں: ''کہاں؟''

چمیلی: ''نیچے کے گول کمرے میں۔''

مَیں: ''بسم اللہ۔''

نیچے کے گول کمرے میں گیا۔ چمیلی مجھے دروازہ تک پہنچا کر رفو چکر ہو گئیں۔ آگے بڑھا تو دیکھا کہ مجلس عقد آراستہ ہے۔ مجلس کے اختصار سے جی بہت خوش ہُوا۔ قاضی صاحب تھے ایک انگریز پولیٹیکل یونی فارم میں تھا، غالبًا____ فارن ڈپارٹمنٹ سے متعلق ہوگا۔ ایک ادھیڑ عمر اور دو سَن رسیدہ معقول صورت حضرات تھے جو ریاست کے کارکن معلوم ہوتے تھے، غالبًا بیگم صاحبہ کے کارندے ہوں گے۔ ذی عزت و وفادار معلوم ہوتے تھے۔ بیچ میں دو زرین کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ جن میں سے ایک پر بلقیس نہایت فوق البھڑک شاہانہ لباس میں مہارانی بنی رونق افروز تھیں اور دوسری خالی تھی بجلی کی تیز روشنی نے بلقیس کے چہرے، زیور اور لباس میں وہ چمک پیدا کر دی تھی کہ نگاہ نہ ٹھیرتی تھی۔ جماعت مختصر تھی مگر منظر شان دار تھا۔ مَیں پہنچا تو مجلس تعظیم کو کھڑی ہوئی اور مجھے اس خالی زرّیں کرسی پر بلقیس کے متصل بٹھایا گیا۔ تعجب ہے کہ سندر یہاں نہ تھے۔

میرے بیٹھتے ہی بلقیس اٹھیں اور قاضی صاحب اور تینوں ریاستی حضرات کے ہم راہ باہر گئیں۔ مَیں اس کمرے میں تنہا انگریز کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ تھوڑی دیر میں باہر گئی ہوئی جماعت واپس آئی، بلقیس اپنی کرسی پر آ گئیں۔ ایجاب وقبول ہوا۔ قاضی صاحب نے اپنے رجسٹر میں ضروری اندراجات کیے۔ ایک علاحدہ سرکاری کاغذ کی بھی خانہ پوری ہوئی۔ گواہوں کے دست خط ہوئے۔ اُس انگریز سے بھی دست خط لیے گئے۔ تین کاغذوں میں سے ایک تو انگریز

نے اپنی جیب میں رکھا، دوسرا بلقیس کو دیا گیا اور تیسرا مجھے۔ مہر چاروں کے ساتھ شرعی تھا۔ ضابطے کی کارروائیوں کے بعد قاضی صاحب کھڑے ہوئے اور خطبہ پڑھا، دعا ہوئی۔ مبارک سلامت ہونے لگی۔ پھول برسائے گئے اور سب کے سب اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئے جہاں ایک پرتکلف ڈنر کا سامان تھا۔ اس ڈنر میں مسٹر سندر لعل بھی انگریزی لباس میں رونق افروز تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان کے چہرے پر مسرت کے آثار نمایاں ہیں۔ دس بجے ڈنر ختم ہوا، مہمان رخصت ہوئے۔ سندر بھی مہمانوں کو رخصت کرنے کے بہانے سے کھسک گئے، صرف وہ انگریز رہ گیا۔ اس تخلیے میں انگریز بلقیس اور میرے درمیان کچھ خاص باتیں ہوئی جو بیشتر ریاست سے متعلق تھیں۔ ان باتوں کے ختم ہوتے ہی انگریز بھی رخصت ہوا اور مَیں بلقیس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے مکان کے بالائی حصے پر گیا۔ پھر بلقیس کے خاص کمرے میں داخل ہوا جسے مَیں نے پہلے نہ دیکھا تھا۔ آراستگی اور سجاوٹ قابلِ داد تھیں، مگر میری نگاہیں تو بلقیس کو سر سے پیر تک دیکھ رہی تھیں۔ وہ قدِ موزوں اس بیش قیمت اور نگاہوں کو خیرہ کرنے والی ساڑھی میں اتنا بھلا معلوم ہوتا تھا کہ نگاہ ہٹتی ہی نہ تھی۔ مجھے شوخی سوجھی اور مَیں نے بلقیس سے کہا: ________ ''مبارک ہو، حق بحق دار رسید'' بلقیس نے گردن جھکا لی اور کچھ نہ کہا۔ مَیں نے اپنی انگشت شہادت سے ان کی ٹھوڑی کو ذرا اُٹھایا اور ان کا منہ اپنی طرف پھیر کر کہا: ''ادھر تو دیکھو، مَیں ایک بات کہتا ہوں۔'' تو ایک ادائے خاص سے میرا ہاتھ ہٹا دیا اور کہنے لگیں! ''ان دست درازیوں سے ابھی معاف فرمایئے۔ آج آپ شاہ جہاں بیگم کے حصے میں آئے ہوئے ہیں۔ قول دے چکی ہوں۔ سہیلیوں میں مجھے شرمندہ نہ کیجیے۔ مَیں شرمندہ ہو کر اپنے دل میں اشعار کے مزے لینے لگا۔

ز نہار مکن دراز دستی
باطرّہ او چہ کارداری
روزے بری بوصل حافظ
گر طاقت انتظار داری

(اپنا ہاتھ ہرگز نہ بڑھا، تجھے اُس کے طرّے سے کیا لینا۔ اے حافظؔ! اگر تُو انتظار کی طاقت رکھتا

ہے تو تجھے ایک دن وصل حاصل ہوگا۔)
مجھے شرمندہ دیکھ کر بلقیس مسکرائیں اور بولیں "چلیے مَیں خود آپ کو شاہ جہاں کے کمرے میں چھوڑ آؤں۔" یہ کہہ کر میرا ہاتھ پکڑا اور دوسرے کمرے کی جانب کشاں کشاں مجھے لے چلیں، اُس کمرے کا دروازہ بند تھا مگر شاید اندر سے چٹخنی کھلی ہوئی تھی کیوں کہ بلقیس نے زور سے ایک لات ماری تو دروازہ کھل گیا۔ ہاتھ پکڑے ہوئے مجھے اندر لے گئیں۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ ایک ہاتھ سے میری کلائی پکڑے رہیں اور دوسرے ہاتھ سے بجلی کا بٹن دبایا، کمرا منور ہو گیا، مسہری پھولوں اور قیمتی پردوں سے پری خانہ بنی ہوئی تھی جس پر میاں سندر نہایت قیمتی زنانہ لباس میں لکھنؤ کی بیگم بنے شرمائے ہوئے، لجائے ہوئے، بل کھائے ہوئے بیٹھے تھے۔
بلقیس: "لیجیے۔ یہ آپ کی شاہ جہاں ہیں۔ جن سے آج آپ کا نکاح ہوا ہے۔ مبارک ہو، حق بحق دار رسید۔" یہ کہا اور میرے دونوں شانے پکڑ کر ان لکھنؤ کی بیگم صاحبہ پر ڈھکیل شوخی سے مسکراتی ہوئی بھاگ گئیں اور دروازہ باہر سے بند کر لیا۔
مَیں "یا اللہ!" میرا اسلسلہ تحیر ختم ہی نہیں ہوتا۔ زلفِ پُر پیچ سلجھنے ہی پر نہیں آتی۔

عقدۂ زلف پیچ پیچ ترا
خرد از مشکلات می گوید

(تری زلفوں کے پیچوں کی گرہوں کو عقل مند بھی لاحل کہتے ہیں۔)
سندر! سچ بتاؤ۔ تم سندر لعل ہو یا شاہ جہاں بیگم یا بلقیس؟ جہاں بیگم کی شادی کی تقریب میں یہ بھی ناٹک کا کوئی سین ہے!"
انھوں نے بجز سکوت کے کچھ جواب نہ دیا۔ جواب کچھ تھا بھی تو تھرتھری اور بدن پر لرزہ کی صورت میں۔ مَیں نہیں جانتا کہ اس کے بعد کیا افتاد پیش آئی۔ مجھ پر ایک بے خودی سی طاری ہو گئی اور ہوش وحواس جاتے رہے۔ بس دیکھا تو یہ دیکھا کہ دونوں ایک دوسرے میں فنا ہیں۔

جذبۂ وصل سجدیست میانِ من وتو
کہ رقیب آمد و پرسید نشانِ من وتو

(میرے اور ترے درمیان وصل کے سجدوں کو دیکھ کر رقیب ہمارا نشان پوچھنے لگا۔)

حجاب اٹھا تو حقیقت کھلی، معلوم ہوا کہ وہ دراصل شہ جہاں ہیں، ہر اعتبار سے شاہ جہاں ہیں۔ سینہ البتہ زرتشتی ہے۔

ملا ہے یار تو نواب اتنے خوش کیوں ہو
خدا ملا، کوئی دولت ملی، خزانہ ملا

☆☆☆☆☆

(۱۲)

خانہ بے تشویش و ساقی یار و مطرب بذلہ گو
موسمِ عیش است و دورِ ساغر و عہدِ شباب

(پرسکون گھر میں ساقی، محبوب اور مطرب دل بہلا رہے ہیں۔ عیش کا موسم ہے۔ عہدِ شباب ہے اور ساغر کے دور چل رہے ہیں۔)

صبح کا سہانا وقت ہے۔ سمندر کی جانب کھلی ہوئی چھت پر نیم مردہ کی طرح آرام کرسی پر لیٹا ہوا ہوں۔ سمندر کی فرحت بخش ہوا مجھ سے آ آ کر معانقہ کرتی ہے مگر میں اس کے لطف سے محروم ہوں۔ دماغ تھکا ہوا ہے۔ رات کو مطلق نہیں سویا۔ تدبیر و تقدیر کی بحث میں الجھنے والو! ذرا مجھ سے بھی تو باتیں کرو، مجھے بتاؤ جو انوکھے واقعات میرے ساتھ چار دن سے پیش آ رہے ہیں۔ ان میں تدبیر کو کس قدر دخل ہے اور تقدیر کو کس قدر۔ ع

خاکم ز کجا بود و نصیبم بہ کجا برد
(میری خاک کو میرے نصیب کہاں سے کہاں لے گیا۔)

بھنڈی بازار اور ہار بنی روڈ میں جوتیاں چٹخانے والا اس وقت کہاں بیٹھا ہوا ہے اور کیا سوچ رہا ہے۔ پانچواں دن ہے کہ اپنی زندگی پر رویو [Review] اور تبدیلی روش کے مسئلے پر غور کر رہا تھا۔ اس وقت تفریحاً یا غم غلط کرنے کو غور تھا۔ اپنی موجودہ ذمے داریوں کا احساس کر کے سنجیدگی

کے ساتھ اِس مسئلے پر غور کرنا ہے مگر ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ چند گتھیاں سلجھانا باقی ہیں۔ رازہائے پنہاں، جنھیں سندر یعنی میری شاہ جہاں نے کسی معشوق کی زلفِ مسلسل کی طرح پیچ در پیچ بیان کیا ہے۔ ابھی کلیتاً منکشف نہیں ہوئے۔ مَیں چاہتا تو مزید تفصیل شاہ جہاں سے رات ہی پوچھ لیتا مگر اس کا ہوش کسے تھا۔

یار ادھر بدمست، مَیں بے خود، تکلف برطرف
ایسی صحبت میں جو آتا ہوش، کیا دیوانہ تھا

یہ کون آیا؟ شاہ جہاں! تم نے اب کیوں یہ مردانہ کپڑے پہن لیے؟

شاہ جہاں: ''ابھی ان کی ضرورت ہے۔''

مَیں: ''خیر ہوگی، مَیں کیا کہہ سکتا ہوں۔ تمھارا قصّہ تمھاری زبان سے ابھی پورے طور سے سنا ہی نہیں جب تک جملہ امور سے کماحقہٗ آگاہی نہ حاصل ہولے۔ مَیں کیسے کچھ کہہ سکتا ہوں۔''

شاہ جہاں: ''تو اب اس قصّے میں رہ ہی کیا گیا ہے۔ اصل واقعہ آپ سن ہی چکے۔ بس ایک یہی بات باقی ہے کہ میرے ساتھ رشی جی کا کیا معاملہ رہا۔ مختصراً عرض کیے دیتی ہوں کہ جو برتاؤ ان کا بلقیس کے ساتھ رہا، وہی میرے ساتھ رہا۔ یہ اختلاف اس کے کہ، میرے پیدا ہونے سے قبل انھوں نے ہدایت فرمادی تھی کہ اس لڑکی کی ولادت خاص اہتمام سے ہو۔ علاوہ خاص خاص لوگوں کے جن میں میرے والدین اور راجا صاحب کے علاوہ صرف تین شخص اور شامل ہیں، کسی کو میرے لڑکی ہونے کا علم نہ ہو۔ بلقیس کی والدہ تک کو آخر عمر تک اس کا علم نہ ہوا۔ خود بلقیس کو بیاہ سے صرف دو دن قبل یہ راز معلوم ہوا۔ ریاست میں ہر شخص مجھے وہی سمجھتا ہے جو آپ باوجود میرے عاشق زار ہونے کے رات کے گیارہ بجے تک سمجھتے رہے، چوں کہ ہم سب کو، جس میں آپ بھی شامل ہیں ابھی ریاست میں چلنا ہے۔ اس وقت تک اس کی ضرورت ہے کہ مَیں اپنی مردانہ شہرت قائم رکھوں۔ جزویات آپ کو وقتاً فوقتاً معلوم ہوتے رہیں گے بلکہ اب تو آپ کے مشورے بغیر اور آپ کے حکم کے خلاف کوئی کام ہی نہ ہوگا۔ نہ کوئی معاملہ آپ سے پوشیدہ رہے گا اور کیسے رہ سکتا جب کہ آپ ہم سب کے سردار، سب کے آقا اور سب پر حکم راں ہیں۔ معاملات کچھ اس درجے

پیچ در پیچ ہیں کہ آنِ واحد میں تفصیلی طور پر سب کا ذہن نشین ہونا ذرا دشوار ہے۔"

مَیں: "پرسوں شب کو تمھارا زنانہ ایکٹ کی تعریف میں مَیں نے جتنے الفاظ تمھاری شان میں استعمال کیے۔ انھیں مہربانی فرما کر واپس کر دو۔ میری داد خالی گئی۔ مَیں تو یہ دیکھ کر متحیر تھا کہ ایک لڑکا کتنی اچھی عورت بنا ہوا ہے مجھے کیا علم تھا کہ ایک عورت مفت عورت ہونے کی وجہ سے داد لے رہی ہے۔

شاہ جہاں: کیا خوب تو پھر عورت ہونے کے باوجود مردانہ پارٹ آپ کے ساتھ جس خوبی سے ادا کیا اس کی داد کس سے طلب کی جائے؟ جس وقت آپ میرے زنانہ ایکٹ کی تعریف فرما رہے تھے، مَیں اپنے آپ کو اس کی داد دے رہی تھی کہ مردانہ پارٹ ماشاءاللہ مَیں نے کس خوبی سے ادا کیا کہ میری نسائیت بھی اب مصنوعی اور قابلِ داد متصور ہونے لگی لیکن خیر اگر آپ کو داد کے دینے میں بھی اس قدر بخل ہے تو بسم اللہ اُسے واپس لے لیجیے۔"

مَیں: "بگڑیے مت، آپ کی نسائیت بھی قابل داد اور آپ اندازِ مردانہ بھی قابلِ رشک مگر یہ تو فرمائیے، کیا واقعی آپ کو ایکٹنگ کا اس درجے شوق ہے کہ اسٹیج کو آپ نے چار چاند لگا دیے اور تماشائیوں کے دلوں کو پامال کرنے میں تھیٹر کا ذریعہ تلاش کرنا آپ کو خلافِ شان نہ معلوم ہوا۔"

شاہ جہاں: "ضرورتاً یہ شوق اختیار کیا گیا، نسائیت کو کامیابی کے ساتھ چھپانے کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہ تھی۔ نسائیت کا چھپانا ہی مقصود تھا، نہ کہ مسخ کرنا، موسیقی کے شوق کا نباہ بھی، اس پردے میں خوب ہو سکتا تھا اور اس شوق کا نباہ بھی از بس ضروری تھا کیوں کہ میرے رشی جی چشتی تھے۔ اسی مصلحت سے ایک ناٹک کمپنی ہمارے ہاں قائم کی گئی جس میں صرف خاص خاص لوگوں کو آنے کی اجازت تھی یعنی روپیہ پیدا کرنے کے لیے وہ کمپنی نہ تھی۔ پرانے خیال کے وضع دار لوگ والد ماجد پر معترض ہوتے تھا اور ان کے پاس جا جا کر کہتے تھے کہ "ناٹک کے شوق میں صاحب زادے صاحب بالکل زنخے بن گئے ہیں۔ آپ انھیں تنبیہ نہیں فرماتے۔ ہمیں تو شرم آتی ہے ہمارے وزیر زادے یوں بال بڑھا کر ناک کان چھدا کر اسٹیج پر ہیجڑوں کی طرح ناچیں اور مٹک مٹک کر ایکٹ کریں، اگر آپ کو اس قسم کے تماشوں کا شوق ہی ہے تو باقاعدہ کمپنی بنائیے اور اس میں پیشہ ور ایکٹر رکھیے۔ لڑکے کی مٹی کیوں پلید کی جاتی ہے۔"

والد مرحوم بے چارے سب کو یہ کہہ کر ٹال دیا کرتے تھے کہ مجھے تو ان تماشوں کا شوق نہیں۔ راجا صاحب کو البتہ نیا شوق پیدا ہوا ہے، تو ان سے جا کر عرض کیجیے۔ رہا لڑکے کا یہ شوق تو یہ سب انگریزی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ انگریزی مذاق ایکٹنگ کو مبتذل نہیں قرار دیتا بلکہ نہایت معزز اور قابلِ فخر سمجھتا ہے۔ لڑکے کا خیال ہے کہ تکمیلِ تعلیم کی غرض سے ولایت جائے گا تو یہ فن اور موسیقی اعلا طبقے میں اس کی رسائی کا باعث ہوں گے۔ وہاں ایکٹروں کو بڑے بڑے خطابات ملتے ہیں۔ وہ لارڈ بنائے جاتے ہیں۔ بادشاہ کے ساتھ ڈنر میں شامل ہوتے ہیں اور سوسائٹی میں عزت کے ساتھ دیکھے جاتے ہیں، وہیں کی تقلید میں ہندوستان کے کالجوں میں بھی بڑے بڑے شریف زادے ایکٹنگ کی مشق بہم پہنچانے لگے ہیں۔ اُن کالجوں میں وقتاً فوقتاً جلسے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ جن میں شرفا کے بچے ناٹک میں حصہ لیتے ہیں اور کام یاب نقالوں کو انعام دیا جاتا ہے۔ یورپ کا مذاق ہمارے مذاق سے بالکل مختلف ہے۔ وہاں کے اصولِ زندگی ہمارے اصولوں سے جدا ہیں۔ وہ لوگ عموماً مادّہ پرست ہیں۔ مفادِ ذاتی اور چند روزہ مادّی کام یابی کے لیے شرافت انسانی کے بعض بہ ترین جوہروں کا ضائع کر دینا ان کے لیے بہت آسان ہوتا۔ یورپ والوں کا خیال ہے کہ نقالی سے لڑکا ذہین ہوتا ہے، چاق و چوبند ہوتا ہے، اس میں تیزی آجاتی ہے اور فطرتِ انسانی کے مطالعے کی اس میں خاص صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے شخص کے ساتھ لوگوں کا جب دنیا میں برتاؤ ہوتا ہے تو کھرے کھوٹے کا بخوبی تمیز کر لیتا ہے۔ خلوص اور مکاری میں فرق معلوم کر لیتا ہے۔ دنیا کے نشیب و فراز سے جب اُس کا سابقہ پڑتا ہے تو مختلف مواقعات کی مناسبت سے مختلف تیور اختیار کر لینے پر اُسے قدرت حاصل ہو جاتی ہے جو دنیا کی کام یابیوں میں بڑی معاونت کا باعث ہوتی ہے۔ ہندوستان بھی یورپ کے خیالات سے متاثر ہونے لگا ہے۔

تقریر یہیں تک پہنچی تھی کہ چمیلی نے آکر اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے۔ دن کے گیارہ بج چکے ہیں۔

مَیں: ''مَیں چاہتا ہوں کہ آج تھوڑی دیر کے لیے باہر ہو آؤں۔''

شاہ جہاں: ''بہتر تو یہ ہوتا کہ آپ ابھی باہر تشریف لے جانے کا قصد نہ فرماتے لیکن چوں کہ آپ

کی اب تک کاروباری زندگی ہے اور آپ اچانک اور بلا کسی انتظام کے ان لوگوں سے علاحدہ ہوئے ہیں۔ انھیں تشویش ہوگی اور آپ کا انتظار بھی کرتے ہوں گے۔ اس لیے مناسب ہے کہ آپ بعد کھانے کے ذرا سا قیلولہ فرما کر تھوڑی دیر کے لیے ہو آئیں لیکن آئندہ کے لیے ذرا لمبی غیر حاضری کا انتظام فرماتے آئیں۔ ابھی ہم لوگوں سے پورے طور پر آپ کا تعارف بھی تو نہیں ہوا۔ چند امور بھی طے کرنے ہیں پھر اب تو آپ کا گھر یہی ہے۔ مستقل اقامت یہیں رکھیے۔ یہ مکان اپنی ہی ملکیت ہے کرائے کا نہیں۔ آمد و رفت کے لیے خدا نے موٹر بھی دے رکھا ہے اور گاڑی بھی، یہاں کا قیام آپ کے کاروبار میں مُخل نہ ہوگا۔ اب آپ کے لیے کہیں اور قیام فرمانا، ایک طرح سے ہم لوگوں کی حق تلفی بھی ہے۔"

چمیلی! دسترخوان چنواؤ اور موٹر کے لیے کہہ دو، سرکار باہر تشریف لے جائیں گے۔"

ہیچ کسے بخویشتن رہ نبرد بسوئے او

بلکہ بپائے او رود ہر کہ رود بکوئے او

(کسی کو بھی خود اُس کا راستا نہیں مِلا، بلکہ جو اس کی گلی میں گیا، وہ اُسی کے پاؤں سے گیا۔)

☆☆☆☆☆

(۱۳)

بفراغِ دل زمانے نظرے بماہ روئے

بہ ازاں کہ چترِ شاہی ہمہ عمر ہائے ہوئے

(ساری عمر بادشاہی کے شور شرابے میں گزارنے سے بہ تر ہے کہ اُس تھوڑے وقت میں اس چاند چہرے کو دیکھوں جب میرا دل فارغ ہو۔)

شہر سے واپس آکر دو گھنٹے سو رہنے کا موقع مل گیا۔ جس سے طبیعت کسی قدر ہلکی ہوگئی۔ شام کا وقت ہے کھلی ہوئی چھت پر آرام کرسیاں بچھی ہوئی ہیں۔ اِدھر میں، اُدھر شاہ جہاں دراز ہیں۔ حدِ بصر تک وسیع سمندر کا پر لطف منظر پیشِ نظر ہے۔ شاہ جہاں چوں کہ غسل کر کے آئی ہیں، بال بکھرے ہوئے

ہیں اور سمندر کی اچھوتی ہَوا، اُن بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہی ہے۔

سر زلفت کہ ہست از باد نیمے راست نیمے کج
برآں رخسار و عارض باد نیمے راست نیمے کج

(تیرے زلف کی چوٹی ہوا کے سبب کج ادائی کرتی ہے اور ہَوا تیرے رخسار اور گالوں پر جھومتی ہے۔)

سوچ رہا ہوں کہ باتیں کروں یا اس حسن کے چھلکتے ہوئے ساغر کو آنکھوں ہی آنکھوں میں پیے چلا جاؤں کہ شاہ جہاں نے خود ہی سلسلۂ کلام چھیڑا۔

شاہ جہاں: آج شہر کا مرحلہ بخیر وعافیت طے ہو گیا۔ کوئی قصہ تو پیش نہیں آیا؟ آپ کی غیر حاضری کا کوئی مضر اثر کاروبار پر نہیں پڑا؟ آپ کے احباب میں چہ میگوئیاں تو نہیں ہوئیں؟

مَیں: احباب میں سے مِلا ہی کون جو چہ میگوئیوں کا حال معلوم ہوتا۔ مَیں تو کھانا کھاتے ہی سیدھا یہاں سے دفتر گیا۔ ڈاک دیکھی، منیجر کو ہدایت کی کہ حساب کتاب کی صفائی کر کے پندرہ دن کے اندر کاروبار بند کر دے۔ مکان گیا، کچھ پہننے کے کپڑے اور دیگر ضروری اشیا، دو ٹرنکوں میں بند کر کے انھیں موٹر پر رکھا۔ بقیہ سامان کے متعلق حکم دے دیا کہ پیک کر کے وطن روانہ کر دیا جائے اور سب لوگوں سے سر دست پندرہ دن کے لیے رخصت ہو کر چلا آیا۔"

وصالِ یار تمہیدِ فراق ہر دو عالم ہے
کہ اس کا ہو کے پھر کوئی کسی کا ہو نہیں سکتا

شاہ جہاں: تو کیا کاروبار کی یک لخت موقوفی کا حکم آپ صادر فرما آئے ہیں۔"

مَیں: "پھر اور کیا کرتا؟"

خرد ضمیر و ہوش و دل وجان وجسمِ من شد
زہمہ خیال خالی بجز از خیالِ رویت

(تیرے چہرے کے تصوّر نے عقل، ضمیر، ہوش، دل، جان اور جسم کو خیالات سے آزاد کر دیا۔)

مجھے تو تم لوگوں نے نکما کر دیا۔ کسی کام کا نہ رکھا، نہ تجارت کے کام کا رہا، نہ زراعت کے، نہ ملازمت کے۔

کنوں یادِ شراب و شاہد و مستی و قلاشی
گذشت ست انچہ خسرو را سرے بودے و سامانے

(اب شراب، محبوب، مستی اور مفلسی کی یاد سے کیا فائدہ، جب خسرو کے پاس سارا سامان ختم ہو گیا۔)

شاہ جہاں: ''تو آپ کو اس کا ملال ہے؟ اس تغیر سے آپ ناخوش ہیں؟''
مَیں: ''ہرگز نہیں۔''

نالہ از بہر رہائی نکند مرغِ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نبود

(یہ پرندہ قید سے رہائی کے لیے نہیں آہ نہیں کھینچ رہا بلکہ اس زمانے پر افسوس کر رہا، جس میں وہ اسیر نہیں تھا۔)

اس تغیر سے ناخوش نہیں، اس اسیری پر نالاں نہیں۔ کاروباری قابلیت کے سلب ہو جانے کی شکایت نہیں بلکہ مسرت ہے۔

من لذّتِ درد تو بدرماں نفروشم
کفر سرِ زلفِ تو بایماں نہ فروشم

(مَیں تیرے درد کی لذّت کو علاج کے عوض فروخت نہیں کروں گا اور نہ ہی تیرے زلف کی چوٹی کا کفر ایمان کے بدلے میں دوں گا۔)

مَیں تو اس احسان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے تیار ہوں بشرطے کہ صحیح طور پر شکریہ ادا کرنے کی صلاحیت بھی ہو، رونا تو اسی کا ہے کہ ان مشاغل کی قابلیت نہ رہی۔ اور ان مشاغل کی استعداد نہیں۔''

زمیں کو ہم سے غبار، آسماں ہم سے خلاف
نہ ہم زمیں کے لیے ہیں نہ آسماں کے لیے

ایسی نکمی ہستیاں بھی کہیں سرسبز ہوتی ہیں۔ مجھ میں تم لوگوں نے کیا دیکھا جو گرفتار کر لیا، کون سی خوبی؟ کون سا کمال نظر آیا جو مَیں نواز لیا گیا؟ بجز نیستی اور نحوست کے مجھ میں کیا ہے جو ان

عنایات ونوازشات کا مستحق سمجھ لیا گیا۔ ؎

نہ شگوفہ، نہ برگے، نہ ثمر، نہ شاخ دارم
ہمہ حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا

(میرے پاس غنچہ، پھول کی پتی، پھل اور ڈالی کچھ بھی نہیں، مجھے حیرت ہے کہ کسان نے مجھے کیوں بویا ہے؟)

شاہ جہاں: ''میرے سر کے تاج، میرے دل کے سرور، میرے کلیجے کی ٹھنڈک، ایسی باتیں کیوں کرتے ہو؟ جن سے نازک دلوں میں ٹھیس لگے۔ دلوں کے سرور کو ملال کی آمیزش سے مکدر نہ ہونے دو۔ خدا خدا کرکے تو یہ دن نصیب ہوا ہے کہ مرادمندوں کی مرادیں برآئیں۔ جذباتِ عشق کی اِن موجوں میں کیا تم تنہا لہرا رہے ہو؟ کیا اس طرف ان بے چینیوں، اس شوق، اس ولولے کے کوئی آثار نہیں پاتے؟ کیا اس معاملے کو تم نے اپنے ذہن میں اب تک بالکل یک طرفہ ہی قرار دے رکھا ہے؟ کیا اب بھی اس کے جتلانے کی ضرورت ہے؟ کہ ادھر سے ذوق بڑھ رہا ہے تو ادھر سے شوق امنڈ رہا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ادھر کے شوق نے ادھر کے ذوق کو ابھارا ہے۔ اس مقناطیس نے اس فولاد کو کھینچا ہے اور لطف بھی اسی میں ہے۔''

مزہ یہی ہے کہ طرفین سے ہو بے چینی
مرے تڑپنے نے تم کو بھی بے قرار کیا

میرے بھولے صیاد تم نے اب تک اپنے آپ کو نہ پہچانا، تمھیں اس کی خبر بھی نہیں کہ تم عاشق نما معشوق ہو۔ کسی کا مقصودِ زندگی ہو۔ کسی کے دل کا چین ہو۔ کسی کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہو۔ تمھاری حیات سے کسی کی حیات وابستہ ہے۔ تمھاری خوشی سے خوشی اور تمھارے غم سے غم ہے۔''

مَیں: ''خیر یہ تو تمھاری عنایت۔ تمھاری عشاق پروری ہے کہ مجھے عاشق نما معشوق بتاتی ہو مگر ہاں اتنا میں بھی جانتا ہوں کہ

ایں ہمہ مستی و بے ہوشی نہ حدِ بادہ بود
با حریفاں ہرچہ کرد آن نرگسِ مستانہ کرد

(یہ ساری مستی و بے ہوشی بلانوشی کی وجہ سے نہیں، رقیبوں کے ساتھ جو کچھ کیا اس نرگسِ مستانہ نے کیا۔)

سے سیج آراستہ نہ ہولے۔ خود اپنے پتی کے نزدیک تک نہ جاویں۔ سوچا تو ہوتا کہ کتنے قوی تعلقات ہوں گے جنھوں نے اس جگ اوپر بات کو ممکن کر دکھایا۔

ایں جاں ز فیض پیر مغاں بزم وحدت است

درپردہ دار دیدۂ کثرت نمائے را

(یہاں پیر مغاں کے سبب وحدت نظر آرہی ہے۔ کثرت دکھانے والی آنکھ کو پردے میں رہنے دے۔)

باوجود اس عقد اور اس قرب کے تم اب تک ہم سے بیگانہ ہو مگر اس میں مجبور ہو، اسی مجبوری میں، اس کشمکش کا لطف ہے۔ **ظلوما جھولا** کی پھبتی تم پر صادق آرہی ہے۔ یہ بیگانگی نادانی کا نتیجہ ہے۔ نادانی جہل اور اس جہل پر اڑنا ظلم۔ ہائے! مَیں نہ ہوئی تمھاری جگہ جو اس موقع پر کہتی۔

مابت پرست وہر رگ ماتارِ کافریست

زنار اگر ہزار بود آں صنم یکیست

(ہم بت پرست ہیں اور ہماری رگ کافری تار ہے۔ زنار ہزار ہوں مگر وہ صنم تو ایک ہی ہے۔)

ہم لوگوں کے معاملے میں تم غیریت اور تفرقہ کے خیال کو دُور کر دو۔ ہم رشیوں کی گود کے کھلیے ہوئے لوگ دریائے توحید کے بلبلے ہیں۔ اسی بحرِ ناپیدا کنار میں ہم نے آنکھیں کھولیں، اسی میں تیرتے پھرتے اور اسی میں بالآخر گم ہو جائیں گے۔

حباب دار ز بہرِ نظارہ آمدہ ایم

کہ سر زنیم و تماشا کنیم و باز رویم

دنیا کی غلط نمائیوں کے فریب میں نہ آوَ۔ آنکیں کھولو، غور و خوض سے کام لو۔ چشمِ حقیقت بیں پیدا کرو پھر دیکھو کہ تماشا کیا ہے۔

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے

پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

بس یہ سمجھو کہ جس طرح ایک شخص مختلف اوقات میں مختلف رنگ اور مختلف اقسام کے لباس میں تمھارے سامنے آتا ہے اور اس کی شخصیت میں فرق نہیں آتا، اسی طرح ایک شخص ہے جسے خدا

نے یہ قدرت دی ہے یا یوں کہو کہ ایک روح ہے جسے یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ مختلف اوقات میں مختلف اجسام کا لباس پہن کر آتی ہے حال آں کہ اپنی ذات سے ایک ہے۔

جامہ زیب اور کوئی روح سا دیکھا نہ سنا
جو پہنتی ہے وہی ٹھیک قبا ہوتی ہے

اس سے بھی آگے بڑھو، مختلف اوقات نہیں بلکہ ایک ہی وقت اور ایک ہی مقام پر، وہی روح مختلف جسمانی آئینوں میں اپنی جھلک مختلف شان سے دکھلاتی ہے۔

روح شمع و شعاعِ اوست حیات
خانہ روشن ازو داد از ذات

(شمع کی روح اور اس کی شعاع زندگی ہے۔ اس سے گھر اور وہ ذات سے روشن ہے۔)

جو کچھ تم دیکھتے ہو، جو کچھ تم سنتے ہو، جو کچھ تم جانتے ہو، سب اسی ایک ذات کا ظہور ہے۔

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا مے نگری انجمنے ساختہ اند

(اس گھر میں ایک چراغ ہے، اس کے سائے سے ہر کسی نے شراب کی محفل سجائی ہوئی ہے۔)

جتنی چیزیں تمھیں دکھائی دیتی ہیں جتنی صورتوں پر تمھاری نظر پڑتی ہے، وہ سب بہ منزل حروف کے ہیں، جن کے تحت میں معنی ہیں۔ یہ جملہ کائنات ایک عبارت ہے جو اپنے دامن میں ایک بہت بڑے معنی کو سمیٹے ہوئے ہے۔

معنیٔ حسنِ تو در صورتِ جاں می بینم
عکسِ رخسارِ تو در جامِ جہاں می بینم

(تیرے حسن کے معنی جان کی صورت میں دیکھتا ہوں اور تیرے رخسار کا عکس جامِ جہاں میں دیکھتا ہوں۔)

رخسار کو دیکھو، عکس پر نہ گرو، اصل کی جانب بڑھو، سایے پر نہ جھکو، پروانہ شمع پر فدا ہوتا ہے، لیمپ کی چمنی اس کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتی۔ چمنی سے الجھتا ہے تو سر ٹکرا کر جان تو دے دیتا ہے مگر لذّتِ سوز سے محروم رہتا اور اپنے مطلب تک رسائی پانے سے ہمیشہ کے لیے مایوس ہو جاتا

ہے۔انسان معشوق پر جان دیتا ہے، معشوق کے لباس پر عاشق نہیں ہوتا۔یہ جداگانہ امر ہے کہ ایک لباس پر دوسرے لباس پر ترجیح دے یا اختلاف لباس سے لطف نظری میں کمی وبیشی محسوس کرے۔لیکن عشق اسے جب ہوگا لباس پہننے والے سے ہوگا نہ کہ لباس سے، جو ہمیشہ تبدیل ہوتا رہتا ہے اور بالآخر سڑ جاتا ہے گل جاتا ہے اور فنا ہوجاتا ہے۔اُس لباس پہننے والے پر نگاہ رکھو، اُس کے طالب بنو جو اسماوصفات کا جوڑا پہن کر صحرائے امکان میں جلوہ افروز ہُوا ہے۔ ؎

خورشید رخت چو گشت پیدا — ذراتِ دو کونِ شد ہویدا

مہرِ رخ تو چو سایہ انداخت — ناں سایہ پدید گشت اشیا

ہم ذرہ ز نورِ مہرِ رویت — خورشید صفت شد آشکارا

ہم ذرّہ بہ مہر گشت موجود — ہم مہر بہ ذرّہ گشت پیدا

دریائے وجود موج زن شد — موجے بہ فگند سوئے صحرا

آن موجِ فروشد و بر آمد — درکسوت وصورت دلآرا

بہ شگفتہ شقائقِ حقائق — بنمودہ ہزار سردِ بالا

ایں جملہ چہ بود عین آن موج — وان موج چہ بود عین دریا

ہر جزو کہ ہست عین کل است — پس کل باشد سراسر اسماً

اجزا چہ بود مظاہرِ کل — اشیا چہ بود ظلال اسماً

اسما چہ بود ظہور خورسید — خورشید جمال ذات والا

صحرا چہ بود زمینِ امکاں — کانست کتاب حق تعالیٰ

اے مغربی ایں حدیثِ بگذار
سرِ دوجہاں مکن ہویدا

(تیرے چہرے کا سورج جب ظاہر ہُوا تو دونوں جہاں کے ذرّات بھی عیاں ہوگئے۔جب تیرے چہرے کے چاند نے اپنا سایا ڈالا تو اس سے ساری چیزیں ظاہر ہوگئیں۔تیرے چہرے کے نور کا ایک ذرّہ سورج کی طرح روشن

ہوگیا۔ وجود کا دریا موجیں مارنے لگا اور ایک موج صحرا کی طرف اچھال دی۔ وہ موج بیٹھی پھر اوپر آ گئی۔ محبوب کی صورت اور لباس میں حقیقت کے پھول کھلے ہیں اور ہزاروں سروِ بلند نمایاں ہو گئے۔ یہ سب کیا تھا وہی موج تھی اور وہ موج کیا تھی وہ عین دریا تھا۔ جو جزو ہے وہ کُل کا عین ہے۔ پھر کُل کا مل اسما ہوتے ہیں۔ اجزا کیا تھے کُل کے مظاہر تھے۔ اشیا کیا تھیں اسما کے سائے تھے۔ اسما کیا تھا سورج کا ظہور تھا اور سورج ذاتِ والا کا حسن۔ صحرا کیا تھا، امکان کی زمین تھی کہ وہی حق تعالیٰ کی کتاب ہے۔ اے مغربی! یہ بات چھوڑ اور دونوں جہانوں کا راز ظاہر نہ کر۔)

تائیدِ مزید کے لیے ایک اور عارف باللہ کا کلام پیش ہے۔ مولانا جامیؒ فرماتے ہیں۔

درکون ومکاں نیست عیاں جز یک نور	ظاہر شد آں نور بہ انواع ظہور
حق نور و تنوع ظہورش عالم	توحید ہمین است دگر وہم و غرور

(کون ومکان میں ایک نور کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ نور مختلف اشیا میں ظاہر ہو گیا۔ حق کا نور عالَم میں متنوع صورت میں ظاہر ہوا۔ توحید ہی اصل ہے باقی سب وہم اور دھوکا ہے۔)

تم مسلمان ہو اور موحد ہونے کا دعوا رکھتے ہو تو اس توحید کو اپنے اوپر طاری کرو ورنہ دعوا غلط۔ توحید کسی زبانی جمع خرچ کا نام نہیں بلکہ ع "یکے داں و یکے بیں و یکے شو" کی حالتِ صحیحہ کا انسانی ہستی پر طاری ہو جانا اصل توحید ہے۔ جنھیں تم اب تک معشوق سمجھے ہوئے ہو، عام اس سے کہ وہ بلقیس ہوں، نور جہاں ہوں، یا بدرِ منیر، کسی کا آئینہ ہیں نہ وہ اپنی ذات سے قائم ہیں نہ اپنے حسن وجمال سے روشن کسی کی شانِ قیومی کا مظہر ہیں۔ کسی کے حسن وجمال کی جھلک دیکھنے کا آئینہ ہیں: ع

آئینہ از رخ تو پری خانہ می شود۔

(آئینہ تیرے چہرے سے پری خانہ بن جاتا ہے۔)

اس پری خانہ یعنی اس آئینہ خانۂ دنیا میں جو آئینہ یا آئینے کا جو ٹکڑا تمھارے سامنے آئے، اس میں یار کے پرتو کو ٹٹولو مگر یاد رکھو کہ اس پرتو تک رسائی اسی وقت ممکن ہوگی جب آئینے کا باقاعدہ

احترام آئینہ ساز کی منشا کے مطابق ملحوظ رکھا جائے۔ مَیں نے اس ذاتِ اقدس کے متعلق جو کچھ بیان کیا اس سے وہ ذات نہایت ارفع واعلا ہے جملہ تشبیہات ناقص اور جملہ اشارات غلط اور اوچھے۔

اے بروں از وہم و قیل و قالِ من
خاک بر فرقِ من و تمثیلِ من

(اے میرے خیال اور گفتگو سے بالاتر، میرے سر اور میری مثالوں پر خاک ہو۔)

مگر جاننے والے اور سمجھنے والے معلوم کر لیتے ہیں کہ ان اشارات اور اس قسم کی تشبیہات وتمثیلات کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ عشق ایک رازداری کا کوچہ ہے اس کوچے کے رازدار ہی ناقص تشبیہوں اور ناکافی اشارات سے جو پا لینے کی باتیں ہیں، پالیتے ہیں۔ افسوس ہے کہ تم نے ہمارے رشی جی کی زیارت نہیں کی۔ ان کی صرف ایک نظر سے وہ دقیق ومشکل وپیچیدہ مسائل حل ہو جاتے تھے جن کی یہ تقریر اور تحریریں متحمل نہیں ہو سکتیں۔ اہلِ حجاب اور کوتاہ فہموں کی طرح کہیں حلول واتحاد کے عقیدے سے مجھے متہم نہ کر دینا۔ حلول اور اتحاد کے لیے تعدد وجود لازم ہے اور یہاں تعدد کا نام ہے نہ نشان۔ یہاں تو بس ایک ہی وجود ہے۔ اب حلول ہو تو کس میں؟ اور اتحاد ہو تو کس کے ساتھ۔

ایں جا حلول کفر بود اتحاد ہم
ایں وحدت است لیک بہ تکرار آمدہ

(اس مقام پر کفر کا حلول اور اتحاد بھی ہوتا ہے۔ یہ وحدت ہے مگر اس میں بحث بھی ہوتی ہے۔)

یہ بھی خیال نہ کرنا کہ مَیں خوبانِ دنیا اور حسینانِ مجازی کی مذمت کرتی ہوں۔ خوبانِ دنیا کی مذمت سے تو اس کی مذمّت لازم آئے گی، جس کی جھلک ان میں نمایاں ہے۔ اور جس کے جمال وکمال کا ان پر پرتو ہے۔

خوبانِ دنیا گو ہمہ خوب انداز از سرتا بہ پا
نامِ خدا آں دل ربا دارد سراپائے دگر

(دنیا کے سارے محبوب اگرچہ سرتاپا حسین ہیں۔ قسم خدا کی اُس دل ربا کا سراپا علاحدہ حسن رکھتا ہے۔)

صرف ضرورت اس کی ہے کہ ہر شے اپنے ٹھکانے پر رکھی جائے ہر چیز کا صحیح مصرف

دریافت کرنا اور اس کے صحیح استعمال میں محدود رہنا، ہمیشہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ ان حسینانِ جہاں کا صحیح استعمال کرو۔ اور جس مقصد کے لیے یہ ہیں، اُس سے تجاوز نہ کرو تو نقصان سے بچو گے اور نفع اُٹھاؤ گے۔ شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی فرماتے ہیں۔

حسن بینی بہرِ حق بینی مثالِ عینک است
می دہد بینائی اندر دیدۂ نظارہ من

(حق کے دیدار کے لیے حسن کو دیکھنا، عینک کی طرح ہے جو میری چشمِ نظارہ کو بینائی دیتا ہے۔)

مگر یہ نظر بازانہ روش ہر کس و ناکس کے لیے مفید نہیں بلکہ اُسی کے لیے مفید ہے جو اس گُن سے کما حقہٗ آگاہ ہو اور اس کے آداب و شرائط بجا لانے کی قدرت رکھتا ہو۔

جہانِ صورت کا ذرّہ ذرّہ جمالِ معنی کا آئینہ ہے
مگر انھیں کو جو دیکھتے ہیں جو جانتے ہیں نگاہ کرنا

یہ راستا جیسا دلچسپ ہے، ویسا ہی پُر خطر بھی ہے۔ لیکن نکتۂ نظر کی صحت اور تزکیہ وتصفیہ کی ضروری منازل طے ہونے کے بعد انسان ان خطرات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ مرزا مظہر جان جاناںؒ فرماتے ہیں۔

نگیرد باطن اہلِ صفا زنگ از نظر بازی
تصرف نیست ہرگز در دلِ آئینہ صورت را

(اہلِ صفا کا باطن نظر بازی سے زنگ آلود نہیں ہوتا۔ آئینے کی طرح شفاف دل میں ہرگز تصرّف نہیں کیا جا سکتا۔)

یورپ نے اس معاملے میں سخت مغالطہ کھایا۔ وہاں کے لوگ مسلمانوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ ان کے ہاں ایک وقت میں چار چار بیویوں کی اجازت ہے جو ان کے نزدیک وحشیانہ رسم ہے کیوں کہ وہ بیوی سے عشق کا ہونا نکاح کا ضروری پیش خیمہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک وقت میں ایک ہی شخص سے محبت کر سکتا ہے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ دل میں ایک ہی کی محبت کی گنجائش ہوتی ہے بلکہ میرے نزدیک تو انسان اپنی عمر میں صرف ایک ہی سے سچا عشق کر سکتا ہے۔

ہم معتقدِ دعوائے باطل نہیں ہوتے
سینے میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے

لیکن غلطی ان لوگوں سے یہ سرزد ہوئی کہ انھوں نے بیوی کو عشق کا محل قرار دے لیا۔

اسرارِ محبت را ہر دل نہ بود قابل
در نیست بہ ہر دریا زر نیست بھہر کانے

(محبت کے رازوں سے ہر دل آگاہ نہیں ہوتا، جس طرح ہر دریا میں گوہر اور ہر کان میں سونا نہیں ہوتا۔)

عشق کوئی بازاری چیز نہیں جسے ہر طالبِ نکاح بوقتِ ضرورت خرید لیا کرے۔ کوئی سہل الوصول شے نہیں جسے انسان اپنی خانہ آبادی کا بنیادی پتھر بنائے۔ کوئی ایسی رقم نہیں، جسے زندگی کی ایک ضرورت کے خرید لے پر صَرف کیا جاسکے۔ عشق کسی دفع الوقتی کا نام نہیں۔ سامانِ تعیش و اسبابِ راحت کی فراہمی کا ذریعہ اور ایک یا متعدد بچوں کے باپ بن جانے کا نسخہ نہیں، بلکہ ایک بہت بڑی چیز ہے جس میں قوت ہے، قیام ہے، دوام ہے۔

عشقے کہ نہ عشق جاودان است
بازیچۂ شہوتِ جوان است

(وہ عشق جو جاویداں نہیں ہے۔ وہ جوان کی خواہشات کا کھیل ہے۔)

خلوص اور ماسوائے المطلوب سے بے تعلقی اور ذاتِ مطلوب میں استغراقِ کلی لوزماتِ عشق سے ہیں۔ عشق ایک اعلا درجے کی خوبی۔ ایک انتہا درجے کی عبادت ہے جو مسلمانوں کے نزدیک مختص ہے۔ اُسی وحدہٗ لاشریک کے لیے جو جملہ عیوب سے پاک، کمالِ حسن و جمال سے آراستہ، جمیع اقسام کی خوبیوں کا مخزن و منبع اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قائم ودائم ہے۔

جسے کہتے ہیں بحرِ عشق اس کے دو کنارے ہیں
ازل نام اس کنارے کا ابد نام اس کنارے کا

ایک ایسی برتر اور لامحدود چیز کا محل ناقص اور محدود چیزیں کیسے ہوسکتی ہیں۔ عشق نام محبت کی انتہائی ڈگری کا اور مسلمانوں کو جتلا دیا گیا ہے کہ جب تک وہ دنیا و مافی ہا حتیٰ کہ والدین اور اولاد اور

خود اپنے آپ تک کی محبت کو خدا اور سول کی محبت میں فنا نہ کردیں، مومن نہیں ہو سکتے۔ ان نسبتًا چھوٹی چھوٹی محبتوں کا اس بڑی محبت میں فنا کردینا عشق ہے۔ ظاہر ہے کہ محبت کا یہ سب سے بڑا مرتبہ کسی ایسے ہی کے ساتھ برتا جاسکتا ہے جو ہر اعتبار سے بڑا ہو اور سب سے بڑا ہو۔ چناں چہ مسلمان مامور ہیں کہ ان کے عشق کا حدِ نظر وہی ہو۔

اے جملہ جہان حسنت آخر چہ جمال است ایں
پنہائی وپیدائی آخر چہ کمال است ایں
در ہر چہ نظر کردم غیر از تو نمی بینم
غیر از تو کسے باشد حقا چہ مجال است

(سارے جہاں میں تیرا ہی حسن ہے۔ جس کی کیا بات ہے۔ چھپنے اور ظاہر ہونے میں کیا کمال کی بات ہے۔ جہاں بھی نظر جاتی ہے۔ تیرے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ کس کی مجال ہے کہ تیرے بغیر بھی کوئی ہو۔)

بیویوں کا ہرگز یہ منصب نہیں کہ وہ اپنے شوہر سے عشق کا مطالبہ کریں۔ وہ اس لیے ہیں کہ اُن سے حسنِ معاشرت برتی جائے۔ انھیں اپنا شریکِ زندگی بناؤ۔ انسان ایک ہی وقت میں متعدّد چیزوں سے محظوظ ہوسکتا ہے۔ مختلف پھولوں کی خوش بو سے شگفتگی حاصل کرسکتا ہے۔ مختلف لذّتوں سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ تم اُن سے لطف اٹھاؤ بلکہ انھیں بھی اپنے سے لطف حاصل کرنے کا موقع دو۔ ان کے حقوق پورے طور ادا کرو اور مذہب کی ان کے متعلق جو ہدایات ہیں۔ ان پر نیک نیّتی اور خوش دلی سے کاربند ہو۔ مراتبِ ظہور کے اختلاف کے ساتھ مراتبِ آثارِ محبت کا اختلاف بھی لازمی ہے۔ ماں، باپ، بھائی، بہن، اولاد، دوست، آشنا؛ ان سب میں، اس کی مختلف شانوں کا ظہور ہے۔ ان سب سے انسان کو محبت ہوتی ہے اور ایک کی محبت دوسرے کی محبت میں سدِّ راہ نہیں ہوتی۔ ایک معتدل مزاج اور سلیم الطبع شخص کے لیے ان سب سے محبت رکھنا اور سب کے حقوق ادا کرنا بالکل آسان ہے — دنیا میں جتنی اشیا ہیں اور ان اشیا جتنی مختلف حالتیں گزرا کرتی ہیں۔ اُتنی ہی مختلف ظہور کی شانیں ہیں۔ ایسی صورت میں کہ جب دو چیزیں یا دو اشخاص اس دنیا میں یک ساں نہیں تو ان کے ساتھ محبت کی مختلف شانوں میں تصادم کیوں کر قیاس میں آسکتا ہے۔

ان امور میں جس قدر خرابیاں واقع ہوتی ہیں۔ سب ان مسائل کی عام غلط فہمیوں کا نتیجہ ہیں۔ کاش ہمارے ملک کی عورتیں اپنے منصب کو صحیح طور پر دریافت کرلیں تو رقابت اور سوتاپے کا ہمیشہ کے لیے سدِّ باب ہوجاوے۔"

مَیں: شاہ جہاں تم کس قدر پیاری باتیں کرتی ہو۔ کسی اور سے یہ تقریر سنتا تو بِلا وجہ بھی اعتراض کرنے کو جی چاہتا اور خواہ مخواہ مضحکے اُڑاتا مگر اس وقت اس پیارے پیارے منہ سے یہ میٹھی میٹھی باتیں اس قدر دل کش معلوم ہوئیں کہ کلیجے میں اتر گئیں۔ اور دل میں انھوں نے گھر کرلیا۔ اس تقریر میں ایک جادو جس نے میرے نقطۂ نظر کو تبدیل کردیا۔ تم نے مسرتِ دائمی کی ایک چابی میرے حوالے کردی۔ ایک خزانہ میرے سپرد کردیا۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ۔ ؎

شاہدِ ما بجز از خال وخط وغبغب خویش
خال و خطِ دگر و غبغب دیگر دارد

(ہمارے محبوب کے جو تل، سبزہ اور غبغب ہے، ان کا حسن عام تل، سبزے اور غبغب جیسا نہیں بلکہ منفرد ہے۔)

مَیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے میری زندگی کے بقیہ حصّے کو ایسے لوگوں کے ساتھ وابستہ کردیا جو ہر اعتبار سے خوب ہیں۔ ؎

گر مطربِ حریفاں ایں پارسی بخواند
در وجد و حالت آرد پیرانِ پارسا را

(اگر حریفوں کے گویّے یہ پارسی پڑھیں گے تو پیرانِ پارسا کو وجد میں لے آئیں گے۔)

ہاں! خوب یاد آیا۔ یہ تو بتلاؤ کہ وہ پان کی ڈبیہ کا راز کیا تھا؟

شاہ جہاں: پان کی ڈبیہ کا راز تو پان کی بیگم ہی بتلائیں گی۔

مَیں: وہ پان کی بیگم کون؟

شاہ جہاں: بلقیس اور کون جو پان کی ڈبیہ سے لیٹر بکس کا کام لیتی ہیں۔ پہلے نامہ بری کی خدمت کبوتر انجام دیا کرتے تھے۔ اب غیر ذی روح ڈبیہ سے یہ کام لیا جاتا ہے۔

مَیں: کیا خوب! تو آخر وہ ہیں کہاں رات سے۔ ''حق بہ حق دار رسید'' کا فقرہ کَس کر ایسی چنپت ہوئی کہ اب تک منہ ہی نہ دکھایا۔ ذرا جا کر میری طرف سے ان کی خیریت تو دریافت کر آؤ اور یہ شعر بھی پڑھ دینا۔ ؎

دیدار می نمائی و پرہیز می کنی

بازار خویش و آتشِ ما تیز می کنی

(دیدار بھی کراتا ہے اور چھپتا بھی ہے۔ اس طرح اپنے بازار کو گرم اور ہماری آگ کو تیز کرتا ہے۔)

شاہ جہاں اپنے بال سنبھالتی ہوئی اُٹھیں اور خرامِ ناز سے بلقیس کے کمرے کی جانب روانہ ہوئیں۔ ذرا دیر بعد وہاں سے اٹھلاتی ہوئی مسکراتی ہوئی آئیں اور کہنے لگیں۔ خدا کا شکر ادا کرتی ہیں۔ خیریت سے ہیں۔ آپ کی اس یاد آوری کی ممنون ہیں اور آپ کے شعر کے جواب میں عرض کرتی ہیں کہ۔ ؎

جوہرِ طینت آدم ز خمیرِ دگر است

تو توقع ز گِلِ کوزہ گراں می داری

(آدم کی طینت دوسرے خمیر کے جوہر سے ہے تو کوزہ گروں کی مٹی سے توقع رکھتا ہے۔)

میں: یا اللہ خاندان کا خاندان تصوّف میں ڈوبا ہوا ہے۔ بات کرنا دشوار ہے۔ پھر جاؤ اور میری طرف سے یہ شعر پڑھ دو۔ ؎

فتنہ انگیزی و دامن در کشی

تیر اندازی کماں پنہاں کنی

(فتنہ اُٹھاتا ہے اور دامن کھینچ لیتا ہے گویا تیر مار کر کمان کو چھپا لیتا ہے۔)

شاہ جہاں پھر گئیں اور یہ جواب لے کر آئیں۔ ؎

تیرِ آہِ ما ز گردوں بگزرد جاناں خموش

رحم کن بر جانِ خود پرہیز کن از تیرِ ما

(پیارے خاموش ہو جا! ورنہ ہماری آہ کا تیر آسمان چیر دے گا۔ اپنی جان پر رحم کر اور ہمارے تیر سے بچنے کی جستجو کر۔)

مَیں: ماشاءاللہ اس وقت طبیعت جولانی پر ہے۔ پھر جاؤ اور میری طرف سے یہ کہو۔

خونے نہ کردہ ایم و کسے را نہ کشتہ ایم
جرمم ہمیں کہ عاشقِ روئے تو گشتہ ایم

(ہم نے کوئی خون یا کسی کا قتل نہیں کیا۔ ہاں! ہمارا جرم یہ ہے کہ ہم تیرے چہرے کے عاشق ہو گئے۔)

بے چاری شاہ جہاں پھر گئیں اور یہ کہتی ہوئی واپس آئیں۔ "آج تو میں پان کی ڈبیہ بنی ہوئی ہوں۔" بلقیس کہتی ہیں۔

دل اندر زلفِ لیلا بند و کارِ عشق مجنوں کن
کہ عاشق را زیاں دارد مقالاتِ خرد مندی

(لیلا کی زلف میں اپنے دل کو باندھ اور مجنوں جیسی عاشقی کر، کیوں کہ عقل کی باتیں عاشق کے لیے مضر ہوتی ہیں۔)

میں: بہت بہتر، تشریف رکھیے۔ آپ کو بہت تکلیف ہوئی، معاف فرمائیے۔

شاہ جہاں: اگر خلافِ مزاج نہ ہو تو اس وقت موٹر پر ہوا خوری کر آئیں۔

مَیں: بہت بہتر، کہ عاشق را زیاں دارد مقالاتِ خردمندی۔

شاہ جہاں: (متبسم ہو کر) تو کپڑے پہنیے۔ مَیں بھی کپڑے پہن کر حاضر ہوتی ہوں۔

زیادہ وقت صَرف نہ ہوا ہوگا کہ دروازے پر موٹر آ گیا اور ہم دونوں اس پر سوار ہو کر روانہ ہوئے۔

مجنوں خموش ناقۂ لیلا بہر قدم
عرضِ نیاز او زبانِ جرس کند

(اے مجنوں! خاموش ہو، کیوں کہ لیلا کی اونٹنی ہر قدم پر صدائے جرس دے رہی ہے۔)

☆☆☆☆☆

(۱۴)

آمادہ گشتہ ام دگر ام شب نظارہ را

پیوستہ کردہ ام جگرے پارہ پارہ را

(مَیں آج رات پھر نظّارے کے لیے تیار رہوا ہوں اور جگر کے ٹکڑوں کو یک جا کیا ہے۔)

موٹر ڈرائیور کے پر لطف ہونے اور واپسی پر بائیسکوپ میں جو دل چسپ واقعات پیش آئے۔ان کی تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں۔شاہ جہاں جس سیر وتفریح، جس کھیل تماشے، جس تقریب، جس [illegible]ت میں ساتھ ہوں گی، وہاں لطف ہی لطف رہے گا۔واپس گھر پہنچے تو رات کے کھانے سے فارغ ہوئے۔خیر یہ سب کچھ تو ہُوا مگر اب ایک نیا مرحلہ درپیش ہے۔ہماری اندرسبھا کا نیا پردہ اٹھنے والا ہے اور بدر منیر ہیروئن بن کر اسٹیج پر جلوہ افروز ہونے کو ہیں۔شاہ جہاں کسی خاص اہتمام میں ہیں۔اور معلوم ہوتا ہے کہ کسی غیر معمولی تزک واحتشام سے آج کے ڈرامے کا خیر مقدم ہونے کو میرے دل کی کیفیت بلا کسی ظاہری وجہ کے اندر ہی اندر کچھ ایسی عجیب وغریب ہورہی ہے جسے مَیں الفاظ میں نہیں ادا کرسکتا۔ایک قسم کی جھجک وکشمکش سی ہے۔کچھ خوف، کچھ سوز، کچھ دریافت نامعلوم کا پوشیدہ اشتیاق۔غرض کہ مَیں صاف طور پر نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہے مگر ہے ایک بالکل جدید۔بالکل انوکھی اور ناقابلِ بیان حالت جو نہایت سرعت کے ساتھ ناقابلِ برداشت صورت اختیار کرتی جاتی ہے۔

از جنبش ایں دریا ہر موج کہ برخیزد

بر وادیٔ جاں آید بر ساحلِ جاں ریزد

(اس دریا کی جنبش سے جو موج اُٹھے گی۔جان کی وادی میں آئے گی اور جان کے ساحل پر پھینکے گی۔)

بالآخر شاہ جہاں آتی ہیں اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس خواب گاہ کی جانب لے جاتی ہیں جو آج کے لیے مختص ہے۔ہم کمرے کے اندر داخل ہوتے ہیں۔جس میں ابھی تک کوئی نظر نہیں آتا۔آرائش البتہ غیر معمولی ہے۔یہاں کسی کمرے میں اس وقت تک یہ چمک دمک دیکھنے میں نہیں آئی۔نہ معلوم کیوں میرے دل نے دھڑکنا شروع کیا۔شاہ جہاں مجھے وہیں چھوڑ کر ایک

پہلو کے کمرے داخل ہوئیں اور معاً ایک سرخ پوش دلھن کا ہاتھ تھامے ہوئے واپس آئیں۔
دولھا دلھن آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ شاہ جہاں نے دونوں کو ایک دوسرے سے انٹروڈیوس کیا۔ انٹروڈیوس کرتے وقت ایک تبسم آمیز ادا کے ساتھ دلھن کے منہ پر سے گھونگھٹ اُٹھایا۔ آنکھیں چار ہوتے ہی اُدھر دلھن، اِدھر دولھا نے ایک چیخ ماری اور دونوں بے ہوش۔

ساکنان سرِ کوئے تو نباشند بہ ہوش
کاں زمینے ست کہ آں جا ہمہ مجنوں خیزد

(تیری گلی میں رہنے والے ہوش میں نہیں رہتے کیوں کہ یہ وہ زمین ہے جہاں مجنوں ہوتے ہیں۔)

☆☆☆☆☆

(۱۵)

آتشِ رخسارِ گُل خرمنِ بلبل بہ سوخت
چہرۂ خندانِ شمع آفتِ پروانہ شد

(گلِ رخسار کی آتش نے بلبل کے خرمن کو جلا دیا ہے۔ شمع کا ہنستا ہوا چہرہ، پروانے کے لیے آفت بن گیا۔)
دن کے گیارہ بجے ہوں گے کہ میری آنکھ کھلی۔ سامنے کیلنڈر پر نظر پڑی اور تاریخ دیکھی تو معلوم ہُوا کہ کمرا ابھی بدلا ہوا ہے۔ ارد گرد مردوں اور عورتوں کا ایک مجمع ہے۔ جن میں سے چند کے سوائے مَیں کسی کو نہیں پہچانتا۔ مامائیں، ملازم، بلقیس، شاہ جہاں، چمیلی، حکیم، ڈاکٹر، وید اور خدا معلوم مجھے کون کون گھیرے بیٹھے ہیں۔ مسہری کے قریب ایک قدِ آدم آئینہ ہے۔ جس کی بدولت اپنی بھی زیارت ہوگئی۔ آنکھوں میں حلقے چہرے پر زردی، بڑھاپے کے آثار نمایاں، معلوم ہوتا ہے کہ برسوں کا مریض ہوں۔ کمزوری اتنی بڑھ گئی ہے کہ کروٹ تک لینا دشوار۔ میری آنکھیں جو کھلیں تو سب کے چہرے مسرت سے دمکنے لگے۔ الحمدللہ۔ یا اللہ! تیرا شکر ہے، احسان ہے، "ہم بے کسوں کا تُو ہی والی ہے۔" "تُو ہی ہمارا کارساز ہے۔" کی صدائیں بلند ہوئیں۔ عورتیں صدقے قربان ہونے لگیں۔ باہر خیرات بٹنے کا حکم دیا گیا مگر مجھ میں بات کرنے کی طاقت نہ

تھی۔اس لیے بات نہ ہوسکی۔روشنی آنکھوں کو ناگوار گزری۔درد کی وجہ سے سر پھٹا جاتا تھا۔اس لیے آنکھیں بند کرلیں۔ذرا دیر میں یوں ہی سی کچھ غنودگی پھر آ گئی۔

شورے شدہ واز خوابِ عدم چشم کشودیم

دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

(ایسا شور اٹھا کہ ہم خوابِ عدم سے بیدار ہوگئے۔جب دیکھا کہ شبِ فتنہ باقی ہے تو پھر نیند کی آغوش میں چلے گئے۔)

سہ پہر کے قریب پھر آنکھ کھلی اور پھر تقریباً اُسی مجمع کو اپنے اردگرد پایا۔اس وقت کلام پر قدرت ہوئی تو بس یہ کہا کہ "میرے پاس سے سب چلے جاؤ۔اس ہجوم سے میرا جی گھبراتا ہے۔تنہا پڑے رہنے دو۔مَیں اچھا ہوں،اطبّا کو رخصت کردو۔میرا مرض ان کے بوتے کا نہیں۔بلقیس کے اشارے پر سب رخصت ہوگئے۔بلقیس بھی رخصت ہوئیں مگر شاہ جہاں چلتے چلتے پوچھنے لگیں کہ مَیں بھی جاؤں؟"

میں نے کہا تم آدھ آدھ گھنٹہ بعد میری خبر لے جایا کرو۔مگر اس وقت سب کے سب میرے پاس سے چلے جاؤ۔میں بالکل تنہائی چاہتا ہوں۔

سب چلے گئے۔اور اس تنہائی میں مجھے کسی قدر سکون ملا۔سکون کیا ملا۔اپنی ہی آگ میں جلنے کا موقع مل گیا۔شورش انگیز بخارات میں پیچ وتاب کھانے کی مہلت ہاتھ آ گئی۔

سوزِ دل از ہر بُنِ مویم نمایاں کردہ اند

ایں جفا جویاں مرا سرو چراغاں کردہ اند

(میرے ایک ایک بال کی جڑ نے دل کی آگ کو تیز کردیا۔ان ظالموں نے مجھے سروِ چراغاں کردیا۔)

چُھریاں بھونک دیں۔زخم ہرے کردیئے۔گذرا ہوا زمانہ یاد دلایا۔بھولی ہوئی مصیبتیں تازہ کردیں۔اے گذشتہ زمانے! تجھ کو تو میں نے فراموشی کی خاک میں دفن کردیا تھا تو نے ایک رُخِ زیبا کے پردہ میں اپنا مہیب چہرہ کیوں دکھایا۔اپنی منحوس یاد کیوں تازہ کی۔

نہ معلوم بے چاری سرخ پوش دُلہن پر کیا بیتی۔اتنا یاد ہے کہ وہ بھی چیخ مار کر بے ہوش ہوگئی تھی۔اس معصوم پری پیکر کا بھلا اس میں کیا قصور۔معلوم ہوتا ہے کہ حوادثات نے اس بے چاری کا بھی

مفت بیچھالیا۔ باتیں ہوں تو راز کھلے۔ مگر نہ معلوم اس وقت طبیعت اس بے کس وغم زدہ کی کیسی ہے؟
"دروازہ پر کوئی ہے؟"
شاہجہاں۔"حاضر ہوئی۔ یہ آپ اس وقت کس سے باتیں کر رہے تھے۔ اب طبیعت کیسی ہے؟"
میں:۔

سرے دارم کہ ساماں نیست اورا
بدل دردیکہ درماں نیست او را

(مَیں وہ سر رکھتا ہوں، جس کی کوئی قیمت نہیں اور دل میں وہ درد ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔)
میں بیمار ہی کب تھا۔ وہ تو ایک جذبہ تھا۔ جس کا میں متحمل نہ ہوسکا اور گر پڑا۔ یادِ ایام کی ایک تاریکی تھی جو چھا گئی۔ جہاں سے آئی تھی وہیں چلی گئی۔ اب کچھ بھی نہیں صرف اثر مابعد کی ایک خفیف سی تلخی ہے جو کروٹیں بدلوا رہی ہے۔ وہ بھی جاتی رہے گی۔ تم لوگ کیوں بلاوجہ پریشان ہو گئے؟"
شاہجہاں۔"سبحان اللہ! اچھا جذبہ تھا جس نے تین دن بے حس و حرکت رکھا۔ اطبا کے دل چھوٹ گئے۔ منہ سے کچھ نہ بولے مگر ان کی ہر ادا سے مایوسی ٹپک رہی تھی۔ تین دن سے ہم لوگوں کو سونا اور کھانا پینا حرام ہے۔ بیچاری بلقیس اس وقت بھی سراوندھائے رو رہی ہیں۔ انھیں اب تک اطمینان نہیں۔ ان ہی پر کیا موقوف ہے کسی کو بھی فکر سے نجات نہیں۔ آپ کی حالت ہی اس قدر تشویش ناک ہو رہی تھی۔ کیا ہوا اگر آپ نے آنکھیں کھول دیں اور دو باتیں کر لیں۔ خدا جلد اپنا فضل کر دے تو ہم تو یہی سمجھیں گے کہ آپ اللہ کے یہاں سے واپس آئے ہیں۔ ذرا آئینے میں اپنا چہرہ اور اپنی آنکھیں تو ملاحظہ فرمایئے آواز میں بھی کس قدر نقاہت ہے"۔
میں: نہیں نہیں۔ میں بالکل صحیح سالم اور تندرست ہوں۔ ایک عارضی حالت تھی جو جاتی رہی۔ اور اس کا جو کچھ اثر تم اس وقت نقاہت وغیرہ کی صورت میں دیکھتی ہو، انشاء اللہ جاتا رہے گا۔ تم جاؤ اور بلقیس کو تسلی دو۔ کھانا کھلاؤ۔ سب کو تسلی دو۔ اور کھانا کھلاؤ۔ مجھے بھی اس وقت کسی قدر بھوک محسوس ہو رہی ہے۔
جب سب کھانا کھالیں تو کوئی نرم و زود ہضم غذا میرے لیے بھی لے آنا۔ ہاں بدر منیر کیسی ہیں؟
شاہجہاں:"اب تو خدا کا فضل ہے۔ چوبیس گھنٹے وہ بھی بے ہوش رہیں۔ بعد میں ہوش تو آیا۔ مگر

کچھ گم سم ہیں۔ بات چیت نہیں کرتیں۔ استغراق کی سی کیفیت طاری ہے۔ بظاہر اُن کی حالت اطمینان بخش ہے۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔ اس قسم کی کیفیتیں ان پر پہلے بھی طاری ہوتی رہی ہیں۔ گو ان کیفیات کا اتنا قیام پہلے کبھی نہیں ہوا۔"

میں: خیر، تم جا کر بلقیس وغیرہ کو تو کھانا کھلانے کا انتظام کرو۔ بعد میں میرے ساتھ تم بھی کھانا کھاؤ۔ مفصل باتیں انشاءاللہ کل ہوں گی۔ آج تکان بہت محسوس کر رہا ہوں۔" تھوڑی دیر میں شاہجہاں کھانا لیے ہوئے آئیں۔ ایک چھوٹی میز مسہری کے قریب لا کر اُس پر کھانا چُنا اور مجھے پلنگ ہی پر اٹھا کر بٹھا دیا۔ کرسی پر خود بیٹھ گئیں۔

شاہجہاں۔ "بسم اللہ، کھانا تناول فرمایئے۔ بلقیس اور گھر کے سب لوگوں کو میں نے آپ کی صحت کا مژدہ سنا دیا۔ سب کو تسکین دے کر انھیں دسترخوان پر بٹھا کر آئی ہوں۔ بلقیس آپ کو مبارک باد دیتی ہیں۔ وہ خود بلکہ سب کے سب اس وقت اظہارِ مسرت اور مبارکباد کے لیے حاضر ہونا چاہتے تھے مگر میں نے اس خیال سے کہ یہ ہنگامہ بحالتِ موجودہ شاید آپ پر گراں گزرے سب کو کل پر ٹال دیا۔"

میں۔ تم نے خوب کیا۔ جو آج انھیں روک دیا۔ مجمع کی مبارک سلامت کے لیے تو میں شاید کل بھی تیار نہ ہو سکوں، مگر ہاں! کل دوپہر کا کھانا تم اور بلقیس میرے ساتھ کھانا۔ تمھیں ایک بھولا فسانہ ایک غم کی کہانی سناؤں گا۔ خدائی قدرت کے کرشمے بیان کروں گا۔"

شاہجہاں۔: "بہت بہتر۔"

میں۔: "بدر منیر نے بھی کچھ کھایا؟"

شاہجہاں۔: "ان کی غذا ہمیشہ سے بہت قلیل ہے اور جب کبھی وہ اپنی کیفیاتِ خاص میں ہوتی ہیں کھانا پینا بالکل ترک کر دیتی ہیں۔ جی چاہتا ہے تو قدرے دودھ یا بعض اوقات فواکہات پر اکتفا کرتی ہیں۔ چناں چہ کل انھوں نے قدرے قلیل دودھ پیا تھا۔ اور آج صبح ایک سنترے میں سے چند قاشیں منہ میں ڈالیں۔ ان پر نصیب اعرا آپ کی طبیعت کے بگڑنے کا حال ظاہر نہیں کیا گیا۔ بلقیس کی یہی رائے ہوئی کہ فی الحال آپ کی موجودہ حالت اُن سے مخفی رکھی جائے۔ نہ معلوم کیا اسرار ہے۔"

میں: "کھانا بڑھاؤ۔ میں سیر ہو چکا۔"

شاہجہاں: ''آپ نے تو بہت ہی کم تناول فرمایا۔ ذرا تو اور ہمت فرمایئے۔ تین دن سے آپ نے کچھ نہیں کھایا۔'' قلب ودماغ پر آپ کے معلوم ہوتا ہے کہ کافی سے زیادہ زور پڑچکا ہے۔ نقاہت بڑھ رہی ہے۔ اس ثقیل غذا سے طبیعت خدانخواستہ زیادہ نڈھال نہ ہو جائے۔ ذرا تو اور تناول فرمایئے۔''

میں: ''بس۔ اب جی نہیں چاہتا۔ کھانا بڑھالو۔''

شاہجہاں: ''میری خاطر یہ یخنی ذرا سی اور پی لیجیے۔''

میں: ''اچھا۔ خیر لاؤ۔ تمہاری خوشی پوری کرتا ہوں۔''

دستر خوان بڑھایا گیا۔ کچھ انگور۔ تھوڑے سے انار کے دانے اور سنترے کی چند قاشیں شاہجہاں میرے قریب رکھی گئیں۔ اور مجھے میری منشا کے مطابق تھوڑی دیر کے لیے پھر لطفِ تنہائی سے حظ حاصل کرنے کے لیے چھوڑ گئیں۔

ہجومِ دردمنداں باز برخاکِ من ست امشب
چراغِ تُربتم از سوزِ دلہا روشن ست امشب

(دردمندوں کا ہجوم آج میری قبر پر جمع ہوگیا ہے۔ میری تربت کا چراغ آج دلوں کی آگ سے روشن ہوگیا۔)

☆☆☆☆☆

(۱۶)

ساقی بیارمئے کہ چناں سوخت دل زعشق
کز سوزایں کباب ہمہ خانہ بو گرفت

(ساقی! شراب لا کہ عشق سے دل جلے اور اس کی بو پورے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔)

بلقیس اور شاہ جہاں حسب قرار داد کھانے پر ساتھ ہیں۔ اور بے چینی سے ایفائے وعدہ کی منتظر ہیں شبِ نکاح کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ ہم تینوں یکجا ہیں۔ بلقیس اپنی ترکیبوں سے ساعی ہیں کہ منیر پر کسی ایسی گفتگو کا سلسلہ نہ چھڑے جو میرے کھانے میں حارج ہو۔ کھانے کی تیاری میں

آج غیر معمولی اہتمام ملحوظ تھا۔ جس کی داد میں نے باوجود عدم اعتدال طبیعت شکم سیری میں غیر معمولی مستعدی کا اظہار کیا۔ اس قصے سے نجات ہوئی تو میں پلنگ پر آ کر بیٹھ گیا۔ بلقیس نے ایک گاؤ تکیہ میری کمر کے پیچھے رکھ دیا۔ جس کے سہارے میں تھوڑی دیر آڑا ترچھا ہوا۔ تھوڑی دیر آنکھیں کھولیں موندیں۔ بالآخر سنبھلا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ بلقیس اور شاہ جہاں پلنگ کے قریب کرسیوں پر چُپ بیٹھیں ہیں۔ میں مسہری پر سیدھا ہو کر بیٹھا تو میری آنکھوں میں کچھ یوں ہی سی نمی آ گئی۔ جسے بلقیس اور شاہجہاں دونوں نے کن انکھیوں سے بغور دیکھا۔ میں نے ان کن انکھیوں کو تاڑ لیا۔ اور اپنی تقریر یوں شروع کی ۔

ماجرائے دل نمی گویم بکس
آبِ چشمِ ترجمانی مے کند

(مَیں اپنے دل کا ماجرا کسی کو نہیں بتاتا کہ میرے اشک میرے دل کے ترجمان ہیں)

میری حالت کا کیا تجسس کرتی ہو۔ میں بہت بُرا آدمی ہوں جتنا برا ہوں۔ اتنا ہی مصیبت زدہ ہوں۔ مجھے اپنا برا اور مصیبت زدہ کہنا شاید تم نیک بخت خاتونوں کو ناگوار گزرے اور اسے تم اپنی توہین سمجھو تو تم سے معافی مانگ کر ان الفاظ کو واپس لیتا ہوں۔ اور ان کی جگہ یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ میں پہلے بہت برا شخص تھا۔ اور میں نے بڑی بڑی مصیبتیں جھلیں ہیں۔ تنگیٔ معاش کی مصیبتیں نہیں۔ بلکہ تنگیٔ دل کی وہ مصیبتیں جن سے کوئی ہم دردی نہیں کرتا۔ جن سے ہم دردی کرنا ایک دنیادار انسان کی قدرت سے باہر ہے۔ افسوس! میں اُن خوش نصیب لوگوں میں سے نہیں۔ جو یہ کہتے سنائی دیتے ہیں۔

خُسرو پس ازیں مذہبِ خورشید پرستی
مومن شدہ در قبلۂ ترسانتواں رفت

بلکہ میں تو ان بدنصیب بلاکشانِ محبت کی صفِ اول کو ہمیشہ رونق دیتا رہا۔ جنہیں یہ شکایت ہے کہ ۔

ہم ندیدے کیا کہیں لطفِ چمن
آنکھ کھولی خانۂ صیاد میں

میں کسی پر الزام نہیں رکھتا۔ کسی کا قصور نہیں بتاتا۔ میرا ہی قصور ہے۔ میرے دل کا قصور ہے۔ اپنے دل سے مجبور ہوں۔ طبیعت سے لاچار ہوں۔

لڑکپن سے ہے مجھ کو عشق اے بت خوبرویوں سے
مچل جاتا تھا اچھی دیکھ کر تصویر مٹی کی!

میری نشوونما کے ساتھ میری اس طبیعت نے بھی نشوونما پائی۔ جتنا بڑھتا گیا۔ اتنا ہی ہلاکت کے قریب پہنچتا گیا۔ مٹی کی تصویر سے عروج پا کر چینی کی مورتوں۔ اور وہاں سے اُچھل کر چلتی پھرتی بولتی چالتی صورتوں میں اُلجھ پڑا۔

اَلشَّبَابُ شُعْبَۃٌ مِنَ الْجُنُوْنِ (جوانی جنون کے درخت کی شاخ ہے) کے چکر میں برسوں رہا۔ اور اچھوں اچھوں کو اندھا بہرا کر دینے والے شیطانی پھندے مدتوں گلے کا ہار رہے۔

مزہ لے لے کے رگڑا ہے گلا شمشیرِ قاتل سے
برنگِ زخم ہم ہنس ہنس کے روئے ہیں لہو برسوں

کوئی چرکا نہیں کو کھایا نہ ہو۔ کوئی غم نہیں، جس میں غرق نہ ہوئے ہوں۔ کوئی مصیبت نہیں جسے جھیلا نہ ہو۔ بدنامی کا ٹوکرہ سر پر لیے پھرے اور کلنک کا ٹیکہ پیشانی پر۔

خوب جی بھر کے ہو لیے بدنام
حق ادا کر دیا جوانی کا!

ناصح کو ہمیشہ دشمن سمجھا۔ ناموس اجداد کے خود دشمن بنے اندیشیوں کا یہ صلہ ملا کہ ایمان کی خرابی۔ دین کی بربادی۔ دنیا کی ذلت و رسوائی۔ قوائے ظاہری و باطنی کا اضمحلال۔ صحت کی شکایت۔ روپیہ پیسے کی خواری۔ اپنوں سے بیگانگت۔ بیگانوں سے دشمنی اور نفرت حصے میں آئی جسے دوست سمجھا اُسے دشمن پایا۔ جس سے وفا کی وہ بیوفا نکلا جس سے امید رکھی اُس سے مایوسی ہوئی۔ یہاں تک کہ شک اور بدظنی کی مہلک بیماری جڑ پکڑ گئی۔ جملہ حسینانِ جہاں کو بدکردار، بے

وفا اور مروم خور سمجھنے لگے۔ نیکی اور نیکوں کے فسانے مقفل کتب خانوں کی کتب قدیمہ کے اوراق کرم خوردہ میں مقید قرار دینے لگے۔ جو نیک بخت خدا پرست بزرگ سامنے آیا۔ ہماری سوئے ظنی کا شکار ہوا۔ دنیا میں جس پر نظر پڑی۔ نکتہ چینی کی نظر پڑی۔ نکتہ چینی کے ساتھ رشک بھی پیدا ہوا۔ رشک نے حسد کی صورت اختیار کی۔ اور حسد نے تکلیف دہ جلن اور بدترین و ذلیل ترین قسم کی سوزش سے سینہ کو جُھلسا ہی رکھا۔

شمع پر گذری ہے جس شب تا سحر
مختصر سی ہے ہماری داستاں

ایک زمانہ تھا۔ خدا اُس منحوس زمانہ کی یاد دل سے نکالے جب ہماری بداعمالیوں کا اکھاڑہ بنارس تھا۔

شہر یست پُر زخوباں و زہر طرف نگارے
یاراں صلائے عام است گر مے کنید کارے

(سارا شہر محبوبوں سے بھرا ہُوا ہے اور ہر طرف ایک حسین ہے اگر کچھ کر سکتے ہو تو صلائے عام ہے۔)

دریا کا کنارہ ہماری شکارگاہ تھا۔ مچھلیوں کے پھانسنے کو وہاں جال پھیلائے جاتے تھے۔ تیر اندازی کی بوچھاڑ ہوتی تھی۔ طلائی و نقری سکّوں سے سادہ لوح پھسلائے جاتے تھے۔ پختہ کارانِ بادیہ ضلالت اور کہنہ مشق شاطروں سے بازیاں بدی جاتی تھیں۔ بارہا ایسا ہوتا تھا کہ جن کے شکار کو جاتے تھے۔ ان کے شکار ہو جاتے تھے۔ رونا تڑپنا تلملانا شیوہ ہو گیا تھا۔ جہاں لوگ اشنان کر کے عمر بھر کے پاپ سے پوتر ہونے کی توقع رکھتے تھے۔ وہاں ہم معصیت کے دریا میں غوطے لگاتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ ہزاروں ہی ناکامیوں کے طمانچے منہ پر پڑے ہوں گے۔ مگر جب کوئی نیا قصہ پیش آیا تو بے حیائی کا خانہ خراب پہلے سے بڑھ کر مستعدی اور جوش کے ساتھ طبع آزمائی کے میدان میں اترے۔ ایک روز دریا کے کنارے اپنی کسی تاک میں پھر رہا تھا کہ ایک شکار پر نظر پڑی۔ دل تڑپ گیا۔ یہ حماقت بھی قابلِ غور ہے کہ اس دورِ تاریک میں جب کبھی چوٹ کھائی، یہی سمجھا کہ یہ چوٹ اگلی تمام چوٹوں سے کراری ہے۔ جب کوئی حسین نظر پڑا، دل حُسنِ

پرست نے یہی فیصلہ کیا کہ ایسا حسین اس سے قبل نہ دیکھا نہ سُنا۔ شیطان کا یہ زبردست مکر تھا۔ کیوں کہ یہی خیال اس کے حصول کی کوشش میں ہمہ تن مصروف کر دیتا تھا۔

چناں چہ اس موقعہ پر بھی دل نے نہایت شدّ ومدّ سے اس خیال پر پختہ کر دیا کہ ایسی نفیس چیز نہ آج تک ہاتھ آئی نہ آئندہ ہاتھ آئے پھر کیا تھا۔ بلائے بے درماں کی طرح پیچھے ہولیا۔ پہلے تو نظریں پھینکیں۔ پھر اشارے کیے۔ مگر وہاں نہ ان کا کچھ اثر نہ اُن کا۔ طبیعت سخت جھنجلائی کہ اس بھولے پن پر حسن کی ضرورت ہی کیا تھی۔ خیال تھا کہ اشنان کریں گی تو آنکھیں چرانے کا کچھ زیادہ موقعہ ہاتھ آئے گا۔ مگر اس میں بھی مایوسی ہوئی۔ اشنان نہ کیا صرف سیر کے لیے آئی تھیں اور بھی طبیعت برہم ہوئی۔ عورت اور حسین عورت دریا پر آئے۔ یار لوگوں کی منظورِ نظر بنے۔ اور یوں بے اشنان کیے چلی جائے اور کوری بچ کر نکل جائے۔ آخر دریا پر آنے کی ضرورت؟ عقل مندی یہ تھی کہ اس خیال کو جانے دیتا۔ مگر توبہ کیجیے یہ سبق ہی نہیں پڑھا تھا۔ وہ تو بھوت سوار تھا۔ ہاتھ دھو کے پیچھے پڑ گیا۔ کچھ نہ پوچھو کیا کیا مصیبتیں اٹھانی پڑیں۔ اور کیسی کیسی رکیک حرکتیں سرزد ہوئیں کہ اب بیان کرتے شرم آتی ہے۔

اس وقت تم دو فرشتے میرے سامنے بیٹھے ہو۔ اِن معصوم دلوں کو اپنی سیاہ کاریوں کی تفصیل سنا کر کیوں مکدر کروں مختصر یہ ہے کہ دو تین دن کی دوڑ دھوپ میں پتا لگا لیا کہ کون ہیں؟ اور کہاں قیام ہے؟۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک مہینے کامل بنارس میں قیام رہے گا۔ بڑی مسرت ہوئی اور یقین ہو گیا کہ اس سونے کی چڑیا کا ہم جیسے شاہ بازوں کے چنگل سے بچ نکلنا اب بالکل ناممکن ہے۔

اپنی پُرانی منجھی ہوئی تدبیروں کو عمل میں لانا شروع کر دیا۔ کٹنیاں روانہ کیں۔ مگر بے سود۔ وہاں رسائی تک دشوار تھی۔ کوئی بہت بڑا امیر کبیر گھرانا تھا۔ بڑے انتظام سے آئے تھے۔ بہت سے لوگ ساتھ تھے ایسے ویسے کی گذر مشکل تھی۔ ہر چند کوشش کی کہ پیام سلام کی نوبت آئے تحفہ تحائف کا سلسلہ جاری ہو۔ مگر کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ روپیہ بھی بہت برباد ہوا۔ راتیں بھی بہت ضائع ہوئیں۔ یار آشناؤں سے لڑائیاں بھی مول لیں۔ اپنوں میں ہی سے رقیب بھی متعدد پیدا ہو گئے۔ قصے نے طول بہت کھینچا۔

بات دور تک پہنچی۔ کئی جگہ ذلتیں اٹھانی پڑیں۔ نقصانات برداشت کرنے پڑے مگر سب بے سود۔ اس ناکامی نے آگ اور بھڑکا دی۔ چار پانچ موقعے ایسے بھی آئے کہ اُس نیک بخت خاتون کا سامنا ہوا۔ اشارہ بازیاں کیں۔ ٹھنڈے سانس بھرے۔ ایک مرتبہ جھوٹ موٹ بے ہوش ہو کر گر بھی پڑا مگر اس پتھر کے بت اس سنگ مرمر کی مورت پر کوئی اثر نہ پایا۔ تب مجبوراً شہر کے چند بدمعاشوں کی روپیے کے بل پر ایک ٹولی بنائی اور یہ خطرناک منصوبہ گانٹھا کہ اُسے کسی تدبیر سے اڑوا دیا جائے۔ طے یہ پایا کہ وہ سیر کو نکلے تو چند بدمعاش تبدیل شدہ حلیہ میں اس پر حملہ آور ہوں اور بجبر اُسے گود میں اُٹھا فرار ہو جائیں۔

تین چار دن بعد ایک میلہ ہونے والا تھا۔ خیال ہوا کہ اُس میلے میں ضرور جائیں گی۔ چناں چہ اس وقت کے لیے یہ اسکیم تیار کر لی گئی۔ اس درمیان میں اتفاقاً ایک دوست سے چلتے پھرتے ملاقات ہو گئی۔ تھے تو ہمارے ہی ہم مشرب مگر بنارس کے ایک بہت بڑے رئیس کے صاحبزادہ تھے۔ ان کے ہمراہ باتیں کرتے کرتے بلاارادہ ان کے مکان تک پہنچ گیا۔ وہاں غیر معمولی چہل پہل نظر آئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی خاص اہتمام درپیش ہے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ کسی کی دعوت ہے۔ زیادہ تفتیش سے پتا چلا کہ جس سنگ دل، بے حس و حرکت مورت نے مجھے ان دنوں پریشان کر رکھا ہے اسی کے گھرانے والوں کی یہ دعوت ہے۔ اور دعوت بھی ایسی کہ تین شبانہ روز سب کے سب یہیں مقیم رہیں گے۔ یہ سنتے ہی میں نے تو ٹوپی اپنے دوست کے قدموں میں ڈال دی اور ہاتھ جوڑ کر بہت عاجزی اور لجاجت سے کہنے لگا کہ ”میری زندگی تمھارے ہاتھ ہے۔ میرا ایک کام کر دو تو عمر بھر احسان مانوں گا۔“ اُس نے ٹوپی اٹھا کر میرے سر پر رکھ دی اور گلے لگا کر کہنے لگا۔ ”تمھارے لیے جان حاضر ہے۔ وہ کون سا مشکل کام ہے جس کے لیے اس قدر پریشان ہوتے ہو۔ وہ جو حال میں تمھاری بابت ایک قصہ میں نے سنا ہے۔ کہیں ان ہی لوگوں سے تو متعلق نہیں؟
میں نے کہا: ”ہاں! انھیں سے متعلق ہے۔ میں اور کچھ نہیں چاہتا۔ بس اتنا کام کر دو کہ اپنی حویلی میں مجھے ایسی جگہ چھپا دو کہ میں سب کو دیکھوں اور مجھے کوئی نہ دیکھے اور کہیں تنہائی کا موقعہ مل جائے تو میری اس کی دو دو باتیں ہو جائیں“۔

میرے دوست نے کہا: ''یہ کتنی بڑی بات ہے۔ آج رات کو آجانا تمھارے حسبِ دل خواہ سارا انتظام ہو جائے گا۔ وہ لوگ آج شام کو یہاں آجائیں گے۔ تم کوئی نو دس بجے رات تک آجانا۔ مگر دیکھو! اس بات کی ہوا تک نہ نکلے۔''

میں نے کہا: ''اجی توبہ کرو۔ مجھے ایسا کچا سمجھ رکھا ہے سرتن سے جدا ہو جائے کسی کو شبہہ تک تو ہونے نہ دوں۔''

ان امور سے اطمینان کر کے گھر آیا۔ اس خطرناک بدمعاشانہ سازش کو ملتوی کیا۔ نہانے دھونے بناؤ سنگار میں مصروف ہوا۔ کیوں کہ عورتوں کو پھسلانے کا سامان اوباشوں کے پاس بس یہی ہوا کرتا ہے بناؤ۔ سنگار۔ روپیہ۔ پیسہ۔ چلتا ہوا پن۔ لفاظی۔ جھوٹے وعدے۔ اور زبانی جمع خرچ۔ اوباشوں سے خدا بچائے۔ اس وقت ایک خدشہ اور پیدا ہو گیا۔ اپنے دوست کے مزاج اور ان کے بے تکے پن سے تو واقف ہی تھا۔ اندیشہ یہ پیدا ہوا کہ حضرت میرے رقیب کی حیثیت اختیار کر کے کہیں پیش قدمی نہ کر بیٹھیں۔ اس خیال نے بہت پریشان کر رکھا۔ یہاں تک کہ میں سورج چھپتے ہی ان کے درِ دولت پر حاضر ہو گیا۔ اُنھیں قول کا سچا پایا۔ میری منشا کے مطابق انھوں نے پورا انتظام کر رکھا تھا۔ یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ کون کس کمرے میں اتارا گیا ہے۔ اپنے مہمان خانہ کا نقشہ مجھے پوری طرح سمجھا کر میری کمین گاہ میں مجھے پہنچا دیا۔ مجھے ''خدا حافظ'' کہتے وقت حضرت نے یہ فقرہ بھی جڑ دیا کہ ''بھئی آج کی فتوحات میں ہمارا بھی حصہ ہے''۔

یہ رات خالی گئی۔ دوسری رات البتہ موقع مل گیا۔ گھر کے سب لوگ یعنی مہمان خانہ والے بے خبر سو رہے تھے۔ لیکن میرا شکارا اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ کبھی لیٹتا تھا کبھی بیٹھتا تھا۔ کبھی اپنے ہینڈ بیگ میں سے ایک کتاب نکال کر پڑھنے لگتا تھا۔

میں دن بھر آج اسی مسئلہ پر غور کرتا رہا کہ یوں جاؤں گا اور یہ کہوں گا۔ اور وہ کہوں گا۔ اس طرح رو دوں گا۔ اس طرح قدموں پر سر رکھ کر آہ وزاری کروں گا۔ اور بالآخر یوں جیب سے رومال نکال کر اپنے گلے میں پھانسی دینے کی کوشش کروں گا۔ اس پر بھی اگر نہ پسیجی تو دھمکی دوں گا کہ میں شور مچا کر لوگوں کو بیدار کرتا ہوں۔ بلا سے میں قید ہی کیوں نہ ہو جاؤں تمھیں تو بدنام کروں گا۔ چناں چہ اس وقت بھی اس قسم کی کھچڑی پکاتا ہوا اور اپنے مفروضہ بانکپن پر اٹھلاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

اس لڑکی نے شیرنی کی طرح میری طرف دیکھا۔ جھپٹ کر اپنے ہینڈ بیگ سے روالور نکالا اور حملہ آور کی شان سے کھڑی ہوگئی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس وقت ایک بلائے ناگہانی آسمان سے ٹوٹی۔ میری اور اس لڑکی کے درمیان ایک شخص حائل ہوگیا۔ نہایت معمر مگر نہایت قوی، دراز قامت۔ چوڑا سینہ۔ یہ بڑا چہرہ۔ چوڑی بھری ہوئی اور تقریباً ناف تک سفید داڑھی۔ اور نہایت روشن مگر غضب آلود آنکھیں۔ نہ معلوم یہ شخص آسمان سے ٹپکا۔ یا زمین سے ابلا۔ یا دیواروں میں سے نکل آیا۔ میری سمجھ میں تو اس وقت یہ آیا کہ شاید مہمانوں میں سے ہے۔ جاگ رہا تھا۔ مجھے آتے دیکھ لیا اور چپکے سے پیچھے ہولیا۔ میں اپنے شکار کے خیال میں محو رہا۔ اور یہ ہم دونوں کے درمیان حائل ہوگیا۔ اس نے اپنی گرجتی ہوئی آواز سے اس زور سے ڈانٹا کہ میں تھرانے لگا۔ ایک تھپڑ اس نے زور سے رسید کیا کہ مغز بھنا اٹھا۔ چند غیرت دلانے والے فقرے ان تیوروں سے کہے کہ میں بھاگنے کو راستا ڈھونڈھتا تھا مگر نہ ملتا تھا۔ بالآخر اُس نے میرا کان پکڑا اور کمرے کے باہر کردیا۔ مجھ پر ایسی ہیبت بیٹھی کہ اپنے اسی چور دروازے سے نکل کر سیدھا گھر کا راستا لیا۔ اور وہاں پہنچتے پہنچتے بخار میں بیہوش ہوگیا۔

چھ مہینے کامل بیمار رہا۔ بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ نہایت درجہ شدائد مجھ پر برستے رہے۔ بلقیس وشاہجہاں! تمھاری رنگت کیوں متغیر ہوتی جاتی ہے۔ یہ ایک خواب تھا۔ جو ختم ہوگیا۔ اس کی تعبیر سے خدا نے بچالیا۔

مکن بچشمِ حقارت نگاہ بر منِ مست

کہ نیست معصیت وزہد بے مشیت او

(مجھ مست کو حقارت سے مت دیکھ، کیوں کہ تقوا اور گناہ اس کی مشیت کے بغیر ممکن نہیں۔)

مجھے اس وقت حقارت سے نہ دیکھو۔ کہہ چکا ہوں کہ میں بہت بُرا آدمی تھا۔ اس فقرے کی تائید میں اپنی سیہ کاریوں کی یہ داستان تمھیں سنائی ہے۔ اب میں تائب ہوں۔ سچے دل سے تائب ہوں۔ خدا میری توبہ قبول فرمائے۔ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ۔ حدیث نبوی ﷺ ہے۔ یعنی تائب نے جیسے کوئی خطا کی ہی نہیں۔ اس چھے مہینے کی علالت شدید نے مجھے

تائب کر دیا۔ اس علالت میں زندگی سے مایوسی نے میرے قلب کی حالت پلٹ دی۔ اس ضعیف مگر قوی الاثر جوان مرد معمر کے شرم دلانے والے فقروں نے۔ اُس تھپڑ اور اس رات کی گوشمالی نے میری کایا پلٹ دی۔ توبہ کرتے ہی میری علالت میں تخفیف شروع ہوگئی۔ یہاں تک کہ میں صحیح سالم اور بالکل تندرست ہوگیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ارحم الراحمین نے میری توبہ قبول فرمالی۔ اور مجھے اپنی شانِ غفاری وستاری کی چادر میں لپیٹ لیا۔

شاہ جہاں! جس دن تم مجھے بنیڈ اسٹینڈ پر اول مرتبہ ملی ہو۔ میں وہ شخص نہ تھا۔ جو کسی زمانے میں بنارس کی گلی کوچوں میں منڈلاتا پھرتا تھا۔ میں نے تم کو اس نگاہ سے کبھی نہیں دیکھا جس نگاہ سے بنارسی چڑیوں کے دیکھنے کا میں عادی تھا۔ بلکہ پاک جذبہ سے تمھیں دیکھا اور پاک جذبہ سے تمھارا تصور کیا تمھیں خود اس کا احساس ہوگا۔ اور میرے اس دعوے کی تم پوری طرح تصدیق کرو گی۔ کیوں کہ تمھیں میرے امتحان کا بھی موقعہ مل چکا ہے۔ اور بلقیس! تم تو میرے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہو۔ تمھیں دیکھتا ہوں۔ یا تمھارا تصور کرتا ہوں تو تصفیہ قلب اور لطافت و پاکیزگی کے جذبات میں منزلوں آگے بڑھ جاتا ہوں۔ یہ نعمتیں مجھے بنارس میں حاصل ہوتیں تو کماحقہٗ اُن کی قدر نہ کر سکتا۔ ایک تھپڑ نے مجھے ان کا اہل بنا دیا۔

میری کثیف وغلیظ زندگی کو لطافت و پاکیزگی سے بدل دیا۔ افسوس اس کا ہے کہ عمر کا بڑا حصہ لغویات ومہلکات میں صرف ہوا۔

یارانِ تیز گام نے محمل کو جالیا
ہم محوِ نالہٗ جرسِ کارواں رہے

وقت کی اس بربادی کا افسوس ہے۔ غفلت میں عمر کے بڑے حصے کے ضائع ہونے کا ملال ہے۔

رفتم کہ خار از پاکشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

(میں پاؤں سے کانٹے نکالنے گیا مگر کجاوہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ ایک لمحے کی غفلت سے منزل سو سال دور ہوگئی۔)

مگر مایوسی کفر ہے۔اور تلافی مابعد کی امید قوی۔

بلقیس وشاہجہاں! تم پر اللہ کی بے شمار رحمتیں۔تم میرے لیے بڑا سہارا ہو۔تم سے مجھے بڑی تقویتِ ہے۔تمھاری پاکیزہ خیالی اور صاف باطنی نے مجھے سنبھال لیا۔تمھارے حسن صورت و سیرت۔تمھاری انسانیت اور تمھاری ملکوتیت سے مجھے ہر لحہ کیفیاتِ صعودی نصیب ہو رہی ہیں۔ تمھاری ہرادا مجھ میں للہیت کی روح پھونکتی ہے۔تم میرے لیے ہادیانِ برحق کی سی برکتیں رکھتی ہو۔میں تمھارا کیوں کر شکریہ ادا کر سکتا ہوں۔

وگوو ند دونوں کھڑے میں کنکے لاگوں پائے
بلہاری گرو آپ کے۔ جن گووند بتائے

ابتدا مقصود تک پہنچنے کا ذریعہ ہی مطلوب ہوتا ہے۔وسیلہ ہی سے سابقہ پڑتا ہے۔اسی سے ربط رہتا ہے۔اسی میں انہماک حاصل ہوتا ہے۔تب کہیں مقصودِ اصلی تک رسائی ہوتی ہے۔تمھارا وجود اس وقت میرے لیے بمنزلہ کشتی کے ہے۔جس میں بیٹھا ہوا اپنی منزل طے کر رہا ہوں۔تم مجھے میرے جدید شوق۔میری مستقل راحت اور میرے مقصد زندگی کی جانب لیے جارہی ہو۔

طاق ابروے تو شد قبلۂ ومن سر بسجود
چشم بددور کہ ہستم بہ نمازے عجبے

(تیرے طاقِ ابرو کے قبلے پر میں سربسجود ہو گیا۔چشمِ بددور میں کیسا نمازی ہوں۔)

بلقیس:''یہ آپ کی ذرّہ نوازی ہے جو ہم ناچیزوں کے متعلق آپ ایسا فرماتے ہیں۔ورنہ من آنم کہ من دانم۔اپنی بابت آپ نے بہت کسر نفسی سے کام لیا۔جو واقعات آپ نے اس وقت بیان فرمائے۔دلچسپی سے خالی نہیں۔مگر آپ نے اُن کے ایک پہلو کو نظرانداز کر دیا۔

کامل اس فرقہ زہّاد سے نکلا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

جن آنچوں میں سے آپ گزر کر آئے ہیں۔ان میں سے گزرے بغیر انسان پختہ نہیں ہوتا۔ اندیشہ کی بات ایسی حالتوں میں بس یہی ہوتی ہے کہ وہیں کا نہ ہو رہے۔وہاں سے بچ کر نکل آنا

سلامتی ہے۔ مستثنیات کو چھوڑ کر عموماً دیکھا یہ جاتا ہے۔ کہ جنھیں آپ کے سے تجربوں سے سابقہ نہیں پڑا، ان میں خامی رہتی ہے۔ اور رعونت و نخوت بسا اوقات ان کی ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔

زاہد غرور داشت سلامت نبرد راہ

رند از رہِ نیاز بدارالسلام رفت

(زاہد مغرور تھا، اس لیے سلامتی کی راہ نہیں پاسکا، جب کہ رند عاجزی کے سبب دارالسّلام تک پہنچ گیا۔)

خوش قسمت ہیں جو زندگی کے مختلف مدارج سے کماحقہ آگاہی حاصل کر کے اپنے نکتۂ اصلی پر آجاتے ہیں۔ اور یوں خوف سے تو نہ عابد مامون ہیں نہ زاہد ۔

ایمن مشو کہ مرکبِ مردانِ زہد را

در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند

نومید ہم مباش کہ رندانِ جرعہ نوش

ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

انسان کی زندگی مین تین مدارج آتے ہیں۔ میں آپ کو مبارک باد دیتی ہوں کہ ان میں سے دو کو تو آپ طے کر چکے۔ اور تیسرے میں نہایت کامیابی اور عمدہ ساز وسامان کے ساتھ آپ نے قدم رکھا ہے خدا آپ کو مزید کامیابیاں عطا فرمائے۔ ۔

حاصل عمرم سہ سخن بیش نیست

خام بدم۔ پختہ شدم۔ سوختم

(میری عمر کا حاصل یہ تین نکتے ہیں۔ اوّل کچا تھا پھر پکا اور آخر جل گیا۔)

☆☆☆☆☆

(۱۷)

ہست محفل برآں قرار کہ بود

ہست مطرب بدآں ترانہ ہنوز

(محفل پہلے جہاں تھی، آج بھی وہیں قائم ہے۔ مطرب وہی راگ الاپ رہا ہے۔)

میں۔ ''ہاں تو اصل بات تو رہ ہی گئی۔ میری اس علالت کا حال تو تم نے سن ہی لیا۔ جس سے میری کایا پلٹی۔ اب اس مختصر سی علالت کی وجہ بھی سن لو جس نے تین دن تک تمھیں پریشان رکھا۔

جس وقت شاہجہاں نے مجھے اور بدر منیر کو آمنے سامنے کیا اور آنکھیں چار ہوئیں۔ تو میں نے انھیں پہچان لیا اور انھوں نے مجھے ۔

من آں ترک طناز را می شناسم

من آں مایۂ ناز را می شناسم

(مَیں اس سرکش محبوب کو جانتا ہوں مَیں اس حسن کے شاہ کار سے آگاہ ہوں۔)

وہ ہی تھیں جنھوں نے بنارس میں مجھے پریشان کیا تھا جو ریوالور لے کر مجھ پر بڑھی تھیں۔ جن کی وجہ سے میں نے تھپڑ کھایا تھا۔ میری گوشمالی ہوئی تھی۔ جن کی معصومیت کے پرتو نے میری زندگی کو تبدیل کر دیا۔ ان کے چہرے پر اب تک معصومیت کا وہی بھولا پن ہے۔ بھولے پن کا وہی نور ہے۔ جس نے ریوالور اٹھانے پر انھیں آمادہ کر دیا تھا۔ ان کی پیاری صورت اور شان دار جسمانی ساخت دیکھ کر مجھے اپنا تاریک زمانہ یاد آ گیا۔ اس طویل اور تکلیف دہ علالت کے شدائد تازہ ہو گئے۔ وہی ہیبت طاری ہو گئی اور وہی تھرتھری جسم میں پیدا ہونے لگی۔ جو چور دروازہ سے نکلتے وقت محسوس ہوئی تھی۔ ان سن رسیدہ بزرگ کا حلیہ سامنے آ گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے وہم نے کوئی صورت لا کر کھڑی کر دی یا کوئی روحانی منظر تھا۔ جس سے میں چونک پڑا۔ اور بیہوش ہو کر گر گیا۔

میں نے صریح اور صاف طور پر دیکھا کہ وہ بزرگ میرے اور بدر منیر کے درمیان کھڑے ہیں۔ چہرہ بے انتہا نورانی ہے جس میں اس وقت بجائے ناپسندیدگی اور عتاب کے خوشنودی اور شفقت کے آثار نمایاں ہیں۔ ایک ہاتھ میرے سر پر ہے اور دوسرا بدر منیر کے سر پر۔ اور ہم دونوں

کو دعا دے رہے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ بدر منیر کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا۔ جو وہ بھی چیخ مار کر گریں اور بیہوش ہو گئیں۔ بہ ہر حال مجھے تو ان کے سامنے جاتے ہوئے کچھ جھجک کچھ خوف۔ کچھ شرم وندامت سی آتی ہے۔ نہ معلوم ان کے دل میں میرے متعلق کیا خیالات ہوں گے۔ میں نے ان پر ظلم کیا ہے۔ میں نے اُن کے ساتھ غیر شریفانہ برتاؤ جائز رکھا۔ میں نے ان پر بزدلانہ جملے کا قصد کیا۔ گو اس قصد نے کوئی عملی صورت اِختیار نہ کی۔ غالباً وہ مجھ کو بہت ذلیل سمجھتی ہوں گی۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ ایسا نہ سمجھیں"۔

بلقیس: اس وقت عجیب انکشافات ہوئے۔ سچ یہ ہے کہ بدر منیر بنارس گئی تھیں اور وہاں ایک مہینہ رہیں۔ ہم سب ان کے ساتھ تھے۔ یہ وہی سفر ہے جو آپ کی تلاش میں تھا۔ تعجب ہے کہ آپ وہاں تھے اور ہمیں نہ ملے۔ ہر کام کے لیے ایک وقت متعین ہے۔ ہمیں پہلے ہی علم ہو چکا تھا کہ آپ سے بمبئی میں ملاقات ہوگی۔ اس سے قبل آپ کا ملنا ناممکن تھا مگر ہماری بے صبری نے ہم کو قبل از وقت ہاتھ پیر مارنے پر مجبور کر دیا اور ایک ایسے سفر پر آمادہ کیا، جس میں بے انتہا صعوبتوں کا سامنا رہا۔ یہ سفر مختلف اعتبارات سے ہم لوگوں کے حق میں نہایت مفید بھی ثابت ہُوا۔ شاید اس میں خدا کی یہی مصلحت ہو اور خدا کو یہی منظور ہو کہ یہ مفاد ہم کو ایک سفر کے ذریعے حاصل ہوں۔ اور اس سفر کا محرک آپ کا خیال بنے۔ اس سفر نے ہمیں آپ تک پہنچایا اور آپ کو ہم تک۔ یہ سفر نہ ہوتا تو ہم بنارس نہ پہنچتے، بنارس نہ پہنچتے تو بدر منیر کا اور آپ کا سامنا نہ ہوتا۔ بدر منیر کا اور آپ کا سامنا نہ ہوتا تو آپ کے ساتھ وہ حالات پیش نہ آتے جو آپ میں اس تغیر کا باعث ہوئے۔ آپ میں یہ تغیر نہ ہوتا تو نہ آپ ہماری قدر کر سکتے نہ ہم آپ کی۔ گویا نہ آپ کی رسائی ہم تک ہوتی نہ ہماری آپ تک۔ یہ بمبئی کے جملہ واقعات نتائج ہیں بنارس کے، ان تمام واقعات کے جو اس وقت آپ نے ہم سے بیان کیے۔ جس طرح شاہ جہاں آپ کو بینڈ اسٹینڈ اور کولابا ریکلی میشنز سے لے کر ہم تک آئیں، اسی طرح بدر منیر آپ کو صبح بنارس سے شام چوپاٹی لے کر پہنچیں۔ شاہ جہاں اور بدر منیر دونوں ہم ہی میں سے ہیں۔ گویا ہم سے آپ کی ابتدا ہوئی اور ہمیں پر آپ کی انتہا ہوگی۔ اس پر بھی آپ نے غور فرمایا کہ بدر منیر پر آپ کی نظر پڑی۔ لیکن ہم میں سے کسی اور پر نظر نہ پڑی حال آں

کہ ہم سب بنارس میں تھے، خیر مجھ پر نظر نہ پڑتا تو کوئی تعجب کی بات نہیں کیوں کہ مَیں بہت کم باہر نکلی مگر شاہ جہاں پر نظر نہ پڑنا تعجب ہے۔ بدر منیر کبھی شاہ جہاں کے بغیر باہر نہیں نکلیں۔ کبھی ان کے بغیر دریا ہر نہیں گئیں۔ حسن و دل کشی میں شاہ جہاں بھی کسی سے کم نہ تھیں، آخر بینڈ اسٹینڈ پر انھوں نے آپ کو تڑپا ہی دیا پھر اس کی کیا وجہ کہ بنارس میں آپ کی طبیعت کو اپنی جانب مبذول نہ کر سکیں۔ حال آں کہ ہمیشہ بدر منیر کے پہلو میں ہوتی تھیں۔ ممکن نہیں کہ ہوا خوری کے موقعوں پر جب آپ کی نگاہ بدر منیر پر پڑی ہو گی تو شاہ جہاں کو بھی وہیں کہیں دائیں بائیں آپ نے نہ دیکھا ہو۔ مگر شاہجہاں کا جادو وہاں آپ پر نہ چلا۔ اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ شاہجہاں مردانہ لباس میں تھیں گو حُسن ایسی چیز نہیں جو اختلافِ لباس سے متغیر ہو۔ چناں چہ بینڈ اسٹینڈ پر مردانہ لباس ہی میں اس حسن نے اپنے شرارے آپ پر پھینکے۔ لیکن آپ میں حسن پرستی کے مادّہ نے بنارس میں کافی نشونما نہیں پائی تھی۔ آپ کو غلط گمان تھا کہ آپ حسن پرست ہیں۔ حالاں کہ آپ عورت پرست بلکہ شہوت پرست تھے۔ اور اس شہوت پرستی ہی نے آپ کو اُن رکیک اور شرمناک صورتوں کے اختیار کرنے پر برانگیختہ کر دیا تھا۔ آپ ہی فرمایئے کہ اُس زمانہ میں کسی حسین پتھر۔ حسین درخت۔ حسین چرند پرند۔ حسن مرد کو دیکھ کر آپ اس قدر محظوظ ہوتے تھے جتنا کہ ایک حسین عورت کو دیکھ کر۔ ایک حسین صعیفہ کو دیکھ کر اس قدر خوش ہوتے تھے۔ جتنا کہ ایک حسین نوجوان عورت کو دیکھ کر۔ ایک حسین معصوم بچہ کی جانب آپ اُن جذباتِ شوق سے بڑھتے تھے جن جذبات سے آپ نے بے چاری بدر منیر کو بدمعاشوں کے ذریعہ بھگا لے جانے کی کوشش کی تھی۔ پھر اس اختلاف کا باعث بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں آپ حُسن پرستی کے صحیح مذاق سے بیگانے تھے۔ جب صحیح مذاق آپ میں پیدا ہو گیا تو آپ کے سندر لعل صاحب نے آپ کو تڑپا دیا۔ اور آپ کے دل میں وہ صدر نشین بن کے بیٹھ گئے۔

ایک امر اور قابلِ غور ہے۔ یہ سفر آپ کی تلاش میں تھا۔ شاہ جہاں آپ کے تجسس میں کبھی بدر منیر کے ہم راہ کبھی تنہا حیران و سرگردان پھرا کیں۔ جہاں کسی میلے ٹھیلے کی خبر پائی یا جہاں کوئی مجمع سنا۔ تلاشِ یار میں وہیں پہنچیں۔

نہ من بیہودہ گرد کوچہ بازاری گردم
مذاقِ عاشقی دارم پئے دیدار میگردم
(مَیں کوچہ و بازار میں بے مصرف نہیں پھر رہا بلکہ عاشقی کا ذوق ہے اور دیدارِ یار کے لیے گرداں ہوں۔)

میری طرح انھیں بھی رشی جی نے آپ کی صورت سے آشنا کر دیا تھا۔ مگر بایں ہمہ انھوں نے آپ کو بنارس میں کیوں نہ پہچانا۔ اور بینڈ اسٹینڈ پر کیوں پہچان لیا۔

اس کا جواب ذرا غور سے سنیے۔ انسان کے افعال و خیالات کا اثر اس کے چہرے پر پڑتا ہے اور ایک خاص بات پیدا کر دیتا ہے۔ فسق و فجور میں مبتلا رہنے والے گروہ کی صورتوں پر ایک بے رونقی سی رہا کرتی ہے۔ جسے ہر کس و ناکس محسوس کر لیتا ہے۔ اس بے رونقی اور عدم نورانیت کے دیر تک رہنے سے اُن لوگوں کے چہروں کی ہیئت تبدیل ہو جاتی ہے۔ ان کے باطن کے عکس اُن کے ظاہر پر پڑتا ہے اور ان کی صورتوں کو مسخ کر دیتا ہے۔ حُسن ان سے مفقود ہو جاتا ہے اور پھیکا پن نمایاں ہونے لگتا ہے۔ قد و قامت کی موزونی۔ ناک نقشے کی درستی۔ اوپری کھال کی سرخی یا سپیدی۔ غرض کہ جملہ اشیا ظاہری اندرونی غلاظت و کثافت کے دبانے اور اس پر غالب آنے میں اتنی ہی ناکام رہتی ہیں جتنا کہ سونے یا چاندی کا قیمتی خوان اور خوش نما فوق البھڑک خوان پوش اندر کے سڑے بُسے غلیظ اور بدبودار کھانے کی بھبک کے دبانے میں ناکام رہتے ہیں۔ اسی بنا پر صحیح مذاق رکھنے والوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ بدقماش اور بدکردار لوگوں کا حسین و جمیل ہونا ناممکنات سے ہے۔ اگر ایسے لوگ کسی کے نزدیک حسین ہوں تو اُس کی نظر کا قصور اور اس کا معیارِ حسن غلط۔ یہ اور بات ہے کہ بُروں کو بُرے ہی حسین نظر آئیں۔ مگر صحیح معیار سے جب حسن کو پرکھا جائے گا۔ تو میرے ہی قول کی تصدیق ہوگی۔

اسی طرح نیک اور برگزیدہ لوگوں کے چہروں پر ایک نور برستا ہے۔ جس سے ہر دیکھنے والا نیک ہو یا بد متاثر ہوتا ہے۔ سِیمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ۔ اُن میں خدا ایک شان پیدا کر دیتا ہے۔ جس سے لوگ دبتے ہیں۔ لچتے ہیں۔ اور اُن کی جانب کھنچتے ہیں۔ یہ باتیں نہایت لطیف ہیں لیکن ان لطافت کے غلبے کا مادی نقوش پر بھی بین اثر

پڑتا ہے اور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکی ہوں۔ انسان کی ہیئت و نمود میں خاصی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ شاہ جہاں پر آپ کی ہیئت منکشف کی گئی تھی جو انھوں نے بینڈ اسٹینڈ پر آپ میں پائی۔ بنارس میں بوجہ اختلاف ہیئت انھوں نے نہ آپ پر نظر ڈالی نہ آپ کو پہچاننے کی کوشش کی نہ آپ کو پہچانا۔ شاہ جہاں کا ملکہ اس بارۂ خاص میں بہت بڑھا ہوا ہے جس کی وجہ سے اس تجسس و تلاش کی خدمت انھیں کے سپرد تھی۔

اس وقت آپ کو بدر منیر سے جو حجاب ہو رہا ہے اُسے میں خود محسوس کر رہی ہوں۔ اُن کے دل میں واقعات گذشتہ کی یاد نے جو بے لطفی پیدا کر دی ہوگی اُسے تو میں انشاء اللہ ابھی جا کر دور کردوں گی۔ مگر آپ بھی اپنی طبیعت کو ذرا سنبھالیے۔ واقعات کے نتائج خیزی اور ان کے پر لطف پہلو کو پیش نظر رکھیے اور تلخ و قابل فراموش پہلو نظر انداز کیجیے۔ مجھے امید ہے کہ آپ دونوں کی آج شب کی ملاقات دونوں کے لیے نہایت دل چسپ اور مسرت انگیز ثابت ہوگی۔"

اب آپ ذرا آرام فرمالیں۔ تکان کے آثار آپ پر پائے جاتے ہیں۔ آج دوپہر کے کھانے پر یاد آوری۔ اور بعد اُس کے واقعات گذشتہ کے ایک دل چسپ اور نتیجہ خیز باب پر گہر افشانی سے اس خادمہ کی جو عزت افزائی فرمائی گئی ہے۔ اُس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں۔ ؎

خوش بود مدتِ وصلِ تو چہ بسیار و چہ کم
سلطنت گر ہمہ یک لحظ بود مغتنم ست

(تیرے وصل کا وقت کم یا زیادہ، بہت اچھا تھا۔ حکومت ایک لحظے کی بھی ہو غنیمت ہوتی ہے۔)

☆☆☆☆☆

(۱۸)

خراشِ سینۂ خود بابتِ خون خوار می گویم
حساب خویش می دانم کہ غم با یار می گویم

(مَیں سینے کے زخم کی بات ستم گر محبوب سے کہہ رہا ہوں۔ اپنا حساب جانتا ہوں اور غم کی بات دل دار سے کر رہا ہوں۔)

بلقیس نے آج دن کو بہت ہی کھری کھری سنائیں۔ عجیب لکچر باز عورتوں سے سابقہ پڑا ہے۔ مگر کہیں سب پتے کی۔ ایک ایک لفظ صحیح تھا۔ سچ ہے کہ بنارس میں حسن پرستی کا صحیح مذاق مجھے نہ تھا۔ متین و مہذب حُسن اتنا بھلا نہ معلوم ہوتا تھا جتنا شاہدانِ بازاری کا اُچھال چھکّا پن۔ عیاری مکار، داوٗ پیچ، تصنع ظاہر و باطن میں اختلاف۔ حسن کا زیور سمجھے جاتے تھے۔ جذبات ناشائستہ کو برانگیختہ کرنے والی اور معصیت کی جانب دعوت دینے والی نگاہ کو شوخ چشمی سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ رقیبوں کا وجود عشق کو پر لطف بنانے اور دل میں سوز و گداز پیدا کرنے کے لیے ضروری قرار دیا گیا تھا۔ قابل داد وہ شخص ہوتا تھا جو فحش اور پھکڑ کو مہذّب الفاظ اور شائستہ پیرائے میں ادا کرنے کی قابلیت رکھتا ہو۔ کوٹھے والیوں کی صحبت اگرچہ بے چاریاں حسن ظاہری تک سے محروم ہوں۔ نشاط انگیز ہوتی تھیں۔ یہ شائستگی اور یہ نفاست، یہ اخلاقی بلندیاں، یہ خلوص، یہ صدق و وفا، یہ شریفانہ جذبات، جو ان عفت و عصمت کی دیویوں کا حصہ ہے کوچہ رُفسق میں ان کی ہوا تک نہیں پہنچی۔

میری اُس قابلِ فراموش زندگی میں بس ایک ہی واقعہ پیش آیا۔ جس میں بدرمنیر جیسی پاکیزہ کیریکٹر کی خاتون نے میرے دل کو اپنی جانب کھینچا۔ مگر اس میں خدا کی جو مصلحت تھی اُس پر بلقیس اپنی آج کی تقریر میں کافی روشنی ڈال چکی ہیں۔ میری زندگی میں یہ پہلی ٹھوکر تھی جس نے میری اصلاح کا دروازہ کھول دیا۔ معلوم نہیں آج بلقیس اور بدرمنیر میں کیا باتیں ہوئیں۔

خدا کرے وہ تکدر دُور ہو گیا ہو۔ جس کا میری سابقہ بیہودگیوں سے اُن کے دل میں پیدا ہو جانا لازمی تھا۔ بلقیس نے اطمینان تو دلایا ہے۔ آج مجھے اظہارِ ندامت کا موقع ملے گا۔ بسبیل تذکرہ اپنی گزشتہ بے تابیوں کی مفصل کیفیت سنانی پڑے گی۔ اور میری وجہ سے اُنھیں کوئی تکلیف

پہنچی ہو تو معذرت پیش کرنا میرا فرض ہوگا۔

شب وصل حل ہونگے کیا کیا معمے
عیاں ہوں گے راز نہاں کیسے کیسے

میں اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ شاہجہاں آکر مجھے اُس کمرہ میں لے گئیں جس میں غش کھا چکا تھا۔ پھر بدر منیر کو میرے سامنے بٹھا کر کھسک گئیں۔ بدر منیر اُسی شب والے سُرخ جوڑے میں دُلہن بنی۔ خاموش، گردن جھکائے بیٹھی رہیں۔ ''آڑ میں گھونگٹ کے آنکھ اور وہ بھی شرمائی ہوئی'' کا سین کھنچا ہوا تھا تھوڑی دیر تک جانبین پر سکوت طاری رہا۔ بالآخر اسی پُرانے گنہ گار نے سلسلہ جنبانی کی۔

میں: ''بیگم۔ مزاج تو اچھا ہے''۔

جواب ندارد۔

میں: ''میں پوچھتا ہوں مزاج تو اچھا ہے۔''

پھر کچھ جواب نہیں۔

میں۔: 'میرے سوال کا جواب نہیں ملا۔ میں مزاج کی کیفیت دریافت کررہا ہوں۔ سُنا تھا کہ نصیب اعدا طبیعت کچھ ناساز ہوگئی تھی۔ اب تو خدا کا فضل ہے؟''

اس پر بھی کچھ جواب نہ ملا تو میں سمجھا کہ دل سے گھنڈی بھی نکلی نہیں۔ بلقیس کو شاید کامیابی نہیں ہوئی۔ اور میری حماقت کا اتنا گہرا اثر اُن کے قلب پر پڑا ہے کہ بات تک کرنے کی روادار نہیں۔ اس خیال سے میرے قلب کو تکلیف پہنچی۔ میں نے پھر کچھ کہنے کا قصد کیا اور دل میں کہا۔

آخر تو لائیں گے کوئی آفت فغاں سے ہم
حجت تمام کرتے ہیں آج آسماں سے ہم

میں: ''اس قدر عتاب معمولی دعا سلام تک تو درکنار میری بات کا جواب تک نہیں ملتا۔

تمھیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہوا گر ایسی ہی خو تو کیوں کر ہو

اس میں شک نہیں کہ میں اس سزا کا مستحق ہوں۔ مجھ سے خطا ہوئی۔ قصور ہوا۔ اپنی غلطیوں کا

اقرار ہے۔اپنی زیادتیوں کا اعتراف ہے۔اس عدالتِ ناز وعشوہ وانداز کے سامنے یہ پرانا گنہگار ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔اور ندامت سے سر جھکائے ہوئے ہے۔

عاشق ہمہ دم فکرِ رخِ دوست کند
معشوق کرشمۂ کہ نیکوست کند
ماجرم و گنہ کنیم۔۔او لطف و عطا
ہر کس چیز کہ لائق اوست کند

(عاشق ہمیشہ محبوب کے دیدار کی فکر میں گم ہوتا ہے۔معشوق نخرے کرتا ہے جو دل کو لبھاتے ہیں۔ہم جرم وخطا کرتے ہیں اور وہ لطف وعنایت کرتا ہے۔ہر شخص وہی کرتا ہے جو اسے زیب دیتا ہے۔)

عفوودرگذر کا سائل ہوں۔معافی کا طلب گار ہوں۔لطف ونوازش کا متمنی ہوں۔

شفیع آوردہ ام پیش تو اینک
رُخِ زردے و چشم اشکبارے

(میرا چہرہ زرد اور آنکھیں اشک بار ہیں، تیرے سامنے یہ سفارشیں پیش کرتا ہوں۔)

تمہارے احسانات کا بار میری کمر کو خمیدہ کیے ہوئے ہے اس قہر کے پردہ میں جو لطف تم نے مجھ پر کیا ہے۔برائی کے بدلے جو بھلائی میرے ساتھ ہوئی ہے۔اس کا شکر ادا کرنا میرے امکان سے باہر ہے۔

سوزِ دل اشک رواں آہِ سحر نالۂ شب
ایں ہمہ از اثر لطف شمامی بنیم

(تپشِ دل، اشکِ رواں، نالۂ شب اور آہِ سحر؛ یہ سب آپ کی کرم نوازی ہے۔)

میری اس معذرت پر بھی سکوت قائم رہا اور اس بنارس والی سنگ مرمر کی مورت نے جنبش تک نہ کی۔منہ چھپائے، گردن جھکائے، جس شان سے آکر بیٹھی تھی۔اسی شان سے کمان بھی بیٹھی رہی۔اب مجھے کسی قدر تشویش ہوئی سُن چکا تھا کہ کیفیات کے دورے ان پر آتے رہتے ہیں۔ اندیشہ ہوا کہ اس وقت کسی ساکت کردینے والی کیفیت کا دورہ تو نہیں۔گھبرا کر ہاتھ بڑھایا اور

دو پٹہ چہرے سے ہٹا کر منہ دیکھا۔

ساکت کر دینے والی کیفیت تو کوئی نہ تھی۔ مگر ایک پُر لطف اور اثر پھیکنے والی حالت ضرور تھی۔ دونوں ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں دو ساغر تھے جو چھلکے پڑتے تھے۔

مہین مہین ہونٹوں میں ایک خفیف سی حرکت تھی مگر آواز نہ تھی۔ چہرہ کے تیور نہایت بلاغت سے کچھ کہہ رہے تھے۔ جو نقشہ اس وقت آنکھوں کے سامنے آیا کچھ ایسا مدہوش کرنے والا تھا کہ میں بہ مشکل اپنے آپ کو سنبھال سکا۔ دو تین منٹ تک میں اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر بدر منیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میں نے کہا۔ ؎

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی

ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

شکر ہے کہ بدر منیر نے اپنے لب ہائے نازک کو میدانِ گویائی میں جنبش دی۔ اور نیچی نظریں کیے ہوئے۔ جیسے کوئی اپنے جذبات پر بڑی جد و جہد سے غالب آ کر کہتا ہے۔ یہ شعر پڑھا۔

اتفاقاً آمدی امروز و ما از مدتے

گوش بر آواز و چشمِ انتظارے داشتیم

(ہم ایک عرصے سے تیری آواز اور دیدار کے منتظر تھے۔ تُو آج اتفاق سے آیا ہے۔)

میں: "بجا ہے۔ یہ انتظار اس لیے تھا کہ میرا خاموش خیر مقدم ہو۔ میرے سوالات کے جواب سے منہ موڑا جائے۔ میری معذرت قبول کرنے سے انکار۔ اور میرے قصور کو معافی سے گریز کیا جائے"۔ ؎

ہنگامِ زہد و توبہ و تقویٰ گذشت و رفت

دورِ حقیقت است و وداعِ مجاز کن (نیاز)

(اب زہد، توبہ اور تقوے کا وقت نہیں رہا۔ مجاز کو چھوڑ اور حقیقت کو دیکھ۔)

میں: "یعنی توبہ کی ضرورت نہیں وہ دور ختم ہو چکا۔ اس دورِ میں دورِ گذشتہ کی باتوں کا ذکر نہ کروں۔ گویا یہ بھی مجھ سے قصور ہوا کہ میں نے وہ واقعہ چھیڑا۔ معافی در کنار۔ فردِ جرم میں ایک اضافہ ہو گیا۔"

بدر منیر: ''چشم بددور آپ نے کیا خوب اس شعر کو سمجھا۔ شاعر رحمۃ اللہ علیہ کی روح بھی اس وقت پھڑک ہی تو اٹھی ہوگی۔ قصور معاف۔ آپ نے تو ظلم پر کمر باندھ لی ہے۔ اشعار پر ظلم۔ شعرا پر ظلم۔ راستہ چلتوں پر ظلم۔ مسافروں پر ظلم۔ مہمانوں پر ظلم۔ آخر اس ظلم کی کوئی انتہا بھی ہے۔ یہ دورِ تظلم کبھی ختم بھی ہوگا؟''

میں: ''فردِ جرم میں ایک اور اضافہ۔''

بدر منیر۔ ''چپ رہوں تو مشکل۔ بات کروں تو برائی۔''

میں۔ ''کیوں صاحب! میں نے کس راستہ چلتے؟ کس مسافر؟ کس مہمان پر ظلم کیا؟ کسی کو دیکھنا ظلم ہے؟ کسی کو دیکھ کر بے چین ہو جانا اور عقل و حواس کھو بیٹھنا ظلم ہے؟''

بدر منیر: ''کسی کو دیکھتے ہی بے چین کر دینا تو ظلم ہے۔ راستہ چلتے پردیسیوں کی راہ میں بار بار آنا اور اپنی سفاکانہ ترکیبوں سے انھیں لوٹنا کھسوٹنا اور غائب ہو جانا تو ظلم ہے۔ اپنے یا اپنے دوستوں کے مہمانوں کی نیندیں اچاٹ دینا اور انھیں بے آرام کر جانا تو ظلم ہے۔''

میں: ''اور کیوں بیگم؟ کسی پر ریوالور لے کر بڑھنا ظلم نہیں؟''

بدر منیر: ''چور اور ڈاکو کے ساتھ یہی برتاؤ مناسب ہے۔''

میں: ''ظلم کے ساتھ اب چوری اور ڈکیتی کا بھی شاندار اضافہ فردِ جرائم میں کر دیا گیا۔ خدا جرائم کی اس زلفِ دراز کو دراز کرے۔

اے کہ با سلسلۂ زلف دراز آمدہ
فرصتت بادکہ دیوانہ نواز آمدہ

(وہ زلفِ دراز کے ساتھ آیا۔ اچھا ہوا کہ دیوانہ نواز آ گیا۔)

بدر منیر: ۔

آفریں بر دلِ نرمِ تو کہ از بہر ثواب
کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدہ

(تیرے رحم دل کو تحسین ہے کہ اپنے ناز کے مارے ہوئے کی نماز کے لیے آیا۔)

میں: ؎

پیشِ بالائے تو میرم چہ بہ صلح وچہ بہ جنگ
کہ بہر حال براندازۂ ناز آمدہ

(تو جس نازوادا سے آیا ہے م۔ یں صلح سے دوں یا جنگ سے لیکن تیرے سامنے ہی جان دوں گا۔)

بدرمنیر: ؎

جاں زِ نظارہ خراب و نازواوانداز بیش
من بہوئے مست وساقی پُر دیر پیانہ را

(میری جان نظارے سے برباد ہوگئی اور تیرے نازوادا بڑھ رہے ہیں۔ مَیں تو خوش بُو ہی سے مست ہوگیا ہوں اور ساقی پیانہ بھر کے دے رہا ہے۔)

میں: ''خدا کے لیے اس بیت بازی کا سلسلہ موقوف کرو۔ لڑائی کی باتیں ہولیں۔ بس اب آؤ کچھ صلح کی باتیں کریں۔ سچ بتاؤ کہ تمہاری موجودگی میں میرا بنارس ہونا تمھیں ناگوار تو نہیں گذرا۔''

بدرمنیر۔ ''آپ کا وہاں ہونا میرے لیے سخت تکلیف دہ ثابت ہوا۔ ناقابلِ برداشت مصائب مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ اور میری زندگی میرے لیے تلخ ہوگئی۔ میں آپ پر الزام نہیں رکھتی اس میں آپ کا قصور نہیں۔ نہ میرا قصور ہے۔ بلکہ سارا قصور اس لاعلمی کا ہے۔ جو مجھے آپ کے متعلق رہی۔ مجھے مطلق علم نہ ہوا کہ آپ کون ہیں؟ میرے آپ کے ازلی تعلقات جن کا اب ظہور ہوا۔ اس وقت مجھ پر ظاہر نہ ہوئے تھے۔ ان تعلقات اور ان پیش آنے والے واقعات سے ایک حد تک میں مطلع ضرور تھی۔'' مجھے علم تھا کہ میں کس کے ساتھ نامزد ہوں مگر یہ علم نہ تھا کہ وہ تقدس مآب ہستی آپ ہیں جن کی ملکیت میں میں روزِ اول سے آچکی ہوں۔ میں آپ کو ایک شخص غیر سمجھتی رہی۔ اور یہ علم غیریت میرے حق میں وبال ہوگیا۔ اُس نے میری ہستی کو برباد کردیا۔

جس وقت بنارس میں میری آپ پر نظر پڑی مجھے تکلیف دہ احساس ہوا کہ ایک غیر شخص للچائی ہوئی نظریں مجھ پر پھینک رہا ہے۔ میں نے چاہا کہ یہ حرکت نازیبا موقوف ہو۔ مگر نہ موقوف ہوئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ شخص میرا تعاقب کررہا ہے۔ مجھ میں برہمی پیدا ہوئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ

وہ اپنی حرکات وسکنات سے اضطراب اور بے چینی کا اظہار کر رہا ہے۔ میرا جی کڑھا اور مجھے اس پر ترس آیا کہ بے چارہ سعی لا حاصل میں مبتلا ہے۔ اور بلا وجہ تکلیف اٹھا رہا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ جس لڑکی نے رشیوں کی گود میں پرورش پائی ہے۔ اور جسے انھوں نے کسی خاص شخص سے منسوب کر دیا ہے اس پر ایک اجنبی شخص کا جادو ہرگز نہیں چل سکتا۔ میں سمجھے ہوئے تھی کہ اس کی کامیابی محال ہے۔ چناں چہ اس کو بے سود کوششوں سے باز رکھنے کی نیت سے میں نے کسی قسم کا التفات اشارۃً یا کنایۃً اس پر ظاہر نہیں کیا۔ اس رات طپنچے کی نمائش بھی اسی مقصد سے تھی کہ اسے پوری طرح یقین ہو جائے کہ یہاں دال گلنے کی کوئی صورت نہیں۔ طپنچہ نکالنے میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ خدانخواستہ وہ باز نہ آیا اور میری عصمت خطرہ میں ہوئی تو اپنا خاتمہ کر کے عصمت کو محفوظ رکھا جائے۔ حاشا وکلّا یہ ہرگز ارادہ نہ تھا کہ ایک مغلوب الحال بے کس و مجبور شخص کے خون ناحق میں اپنے ہاتھ رنگوں۔

اس شب کے واقعہ کے بعد جب تک میں بنارس میں رہی اُس شخص پر نظر نہیں پڑی۔ میں نے نتیجہ نکالا کہ میری تدبیر کارگر ہوئی۔ اور وہ بے چارہ مجھ سے بالکل مایوس ہو گیا۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ خدا نے اُس کے شر سے مجھے محفوظ رکھا۔ مگر اس ناکامی اور شکستگی دل پر جی کُڑھا۔

اس جی کا کڑھنا قیامت ہو گیا۔ میں نہایت ضابطہ اور دل پر جبر کرنے والی عورت ہوں۔ مگر ہر چیز کا اثر بہت جلد قبول کرتی ہوں۔ اس بے چارگی اور محرومی کے خیال نے جو ابتدا ضعیف تھا رفتہ رفتہ جڑ پکڑ لی۔ اور بتدریج قوی ہوتا گیا۔ ترس نے ہم دردی کی صورت اختیار کی۔ ہم دردی نے انس کی۔ انس نے محبت کی۔ حتّا کہ حضرتِ عشق نے اپنی انگیٹھی دہکا دی۔ اخفا نے کیفیاتِ عشق کو خطرناک قوت دیدی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ؎

رخنہ ہائے بے عدد ہجر تو در دل ساختہ
عشق چوں زنبور در ہر خانہ منزل ساختہ

(تیرے ہجر نے دل کو چھلنی کر دیا ہے اور عشق نے شہد کی مکھی کی طرح ہر چھید میں گھر کر لیا ہے۔)

میں حیرت میں تھی کہ میری کیوں یہ حالت ہو گئی۔ ایک سرسری اور خفیف سے خیال نے کیوں ایسی مہیب صورت اختیار کر لی جس نے میرے ضبط و تحمل کو ملیامیٹ کر دیا۔ صبر و توانائی کو

پامال کر دیا۔ جدید انکشافات کی بنا پر اب میں یہ دعوا کرنے کی جرأت کر سکتی ہوں کہ جسے میں نے اپنا ضعف سمجھا وہ در حقیقت ضعف نہ تھا بلکہ توانائی اور ہمت تھی۔ میری نظر کسی اجنبی شخص پر نہیں پڑی۔ بلکہ اپنے پر پڑی۔ میری نظر اسی پر پڑی۔ جو میرا آقا، میرا سوامی، میری پرستش کا مرکز جسمانی تھا۔ مجھے اس سے نسبت ازلی تھی۔ وہ کسی رنگ کسی ڈھنگ میں ہو، کسی روپ کسی ہیئت میں پھرے، میرے لیے ہمیشہ مقناطیس کا حکم رکھتا ہے اُس کی نگاہیں ہر وقت میرے جگر کے پار ہونے کی قدرت رکھتی ہیں۔ اُس کی ادائیں کسی وقت مجھے پامال کرنے میں کوتاہی نہیں کر سکتیں۔ اس کی کششِ مقناطیسی نے مجھے اپنے مفروضہ مقام خودی سے ہٹا دیا تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوئی۔ تعجب کی بات صرف یہ ہوئی کہ میرے جہل نے مجھے ہلاک کیوں نہ کر دیا۔ مجھے جس قدر شکایت ہے اس جہل و نادانی سے۔ علم ہوتا کہ مقناطیس مجھے اپنی جانب کھینچ رہا ہے تو میں نہایت ذوق و شوق سے

ع ہمہ آہوانِ صحرا سر خود نہادہ بر کف

(صحرا کے تمام ہرن اپنے سروں کو ہتھیلی پر رکھے تیرے پاس لائے ہیں۔)

کی صف میں شامل ہو جاتی۔ ''بہ امید آں کہ روزے بشکار خواہی آمد'' میں نہایت صبر و استقلال سے وقت موعود کا انتظار کرتی اور دن گن گن کر یہ زمانہ تیر کر لیتی۔ لوگ عشق میں انتظار کا لطف اٹھاتے ہیں۔ امید سے تقویت حاصل کرتے ہیں۔ مگر میرے لیے نہ انتظار کا لطف تھا۔ نہ امید کی گدگدی۔ میرے دل میں میری طرف سے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ اس وہم غیریئت نے مجھے میری نگاہ میں ذلیل کر دیا تھا۔ دل میں کہتی تھی کہ ہے! ہے! کیسی غضب کی بات ہے کہ میں ملکیت تو اپنے رشیوں کے بتائے ہوئے سچے آقا کی ہوں، اور جل رہی ہوں ایک اجنبی کی آگ میں جس کا عدم وجود میرے لیے برابر ہے۔ میں ان نجس انگاروں کو اپنے سینے میں لے کر اپنے مالک سے کیسے مل سکتی ہوں۔ نکاح والی رات میرے لیے غم کی کالی گھٹا تھی۔ باہر نکاح پڑھا جا رہا تھا اور اندر میں موت کی تمنا کر رہی تھی۔ اس جہل مرکب میں مَیں ہی فرد تھی۔ شاہجہاں آپ کو دیکھ چکی تھیں۔ بلقیس کی آپ سے باتیں ہوئیں تھیں۔ نور جہاں بھی شرفِ زیارت سے مشرف ہو چکی تھیں۔ گو آپ کو اس کی اطلاع نہ ہو۔ میں ہی ایک گناہ گار دُکھیا اس تسکین سے محروم رہی۔ مجھے گوارا نہ ہوا

کہ جن گناہ گار نگاہوں نے میرے ساتھ دشمنی برتی اور مجھے مجھ سے بیگانہ کر دیا۔ اُن کی پرچھائیں آپ پر پڑنے دوں۔ یہ خیال آتا تھا کہ اب آپ سے آنکھیں چار ہونے والی ہیں تو گویا دوزخ کے سانپ بچھو مجھ سے چپٹ جاتے تھے اور نہایت کرب و جانکنی کا باعث ہوتے تھے۔ اپنے اور پرائے میں تمیز نہ کر سکنا، ان جملہ مصائب و آلام کا موجب ہوا۔ ورنہ یوں مجھ سے نہ کوئی گناہ سرزد ہوا نہ کسی کی حق تلفی عمل میں آئی۔ سوئے معرفت کی کوتاہیوں نے مجھ پر یہ کچھ عذاب برسایا۔ میری سہیلیاں مجھ سے پوچھتیں تو میں کچھ نہ کہہ سکتی۔ بلکہ اُن سے جی چراتی اور بھاگتی۔

ایں چہ استغناست یارب ویں چہ قادر حاکمت
کیں ہمہ زخم نہاں ست و مجالِ آہ نیست

مگر میرا اللہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ اس دُکھیا کی حالت، زار پر اُسے ترس آ گیا تھا کہ اُس نے اپنی رحمت کے بادلوں کو جنبش دی اور اکرام و نوازش کی بارش سے مجھے ازسرِنو تروتازہ اور سرسبز کر دیا۔

قتل کے بعد رحم آتا ہے
یہ پتا ہے ہمارے قاتل کا

میرے دل کا مکین جس وقت میری آنکھوں کے سامنے آیا۔ تاریکی کافور ہو گئی۔ آبِ حیات نے اپنی روح پرور موجوں کی آغوش میں مجھے لے لیا اور حیاتِ جاوید کا سہرہ میرے سر پر باندھ دیا۔"

تقریر یہاں تک پہنچی تو بدرمنیر نے نظر اٹھا کر مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ تھوڑی دیر ٹکٹکی باندھے تصویر بنی بیٹھی رہیں۔ اس کے بعد پھر سلسلہ تقریر کو جاری کرنا چاہا کہ میں نے روکا۔ کیوں کہ میں دیکھ رہا تھا کہ اس وقت وہ ایک خاص جذبے سے متاثر ہیں۔ ضعف اُن کا بڑھ رہا ہے۔ اب تک کی تقریر اُن کے دل و دماغ پر کافی اثر ڈال چکی ہے۔ سال ہا سال کی دبی ہوئی آگ کا دھواں نکل رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ زیادتی مضر ثابت ہو۔ اور طبیعت خدانخواستہ خراب ہو جائے۔ چناں چہ میں نے کہا۔

بدرمنیر! بس کرو۔ آج اس تقریر کو یہیں تک رہنے دو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تکان تم میں بڑھ رہا ہے اور تمھارے جذبات کا سیلاب امنڈتا چلا آتا ہے۔ یہ قصے ایک شب میں ختم ہونے والے

نہیں۔تمہارے غم کی کہانی اور میرے مصائب کی داستان شبِ عروسی کے لیے موزوں ہیں"۔

گذشت انچہ گذشت

(جو گزر گیا، سو گزر گیا)

فراموشی کے قابل جو باتیں ہیں انھیں اب فراموش کر دینا چاہیے۔اور یاد رکھنے کی باتیں یاد رکھنا چاہیے۔آؤ! اب اس دورِ جدید کا خیر مقدم کریں۔اور ماضی کی تلخیوں کو مستقبل کی خوش آئند مسرتوں اور حال کی خوش وقتیوں میں گم کر دیں۔

بیا تا درصفِ زنداں بہ بانگِ چنگ مئی نوشم
کہ سازِ شرع زیں افسانہ بے قانوں نخواہد شد

(تُو آ! تا کہ رندوں کی محفل میں رباب کی لے پر شراب پیئیں۔اس افسانے سے شرع کا ساز غلط نہیں ہو گا۔)

☆☆☆☆☆

(۱۹)

حدیثِ زلفِ دلاویز آں نگارا مشب
زمن مپرس کہ بس خاطر پریشاں ست

(میرا دل بہت پریشان ہے۔اس لیے اس دل بر محبوب کی زلف کے بارے میں مجھ سے بات نہ کر۔)

قدرت کی رنگا رنگ گلکاریاں۔دیکھنے اور سوچنے والے انسان کو مبہوت کر دینے کے لیے کافی ہیں۔جمال میں جلال کی شعاعیں۔اور جلال میں جمال کی ٹھنڈک۔اس قادرِ مطلق ہی کی کاری گری کا ایک حیرت میں ڈالنے والا نمونہ ہے۔اس اجتماعِ ضدین اور اجتماعِ نقیضین ہی پر کیا موقوف ہے۔ہر محال اُس کے کارخانے میں ممکن اور ممکن محال ہو جاتا ہے۔فطرت انسانی کا مطالعہ تمام علوم کی نسبت اس لیے زیادہ دلچسپ اور زیادہ مفید ہے کہ کمالاتِ الٰہی کے اعلا درجہ کے آثار اور اس کے جمال وجلال کی اجتماعی اور انفرادی شانیں یہاں نظر آتی ہیں اور خدا کی خدائی کے ڈنکے بجاتی ہیں۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مجھے کن خیالات نے پریشان رکھا تھا اور بدر منیر کن اوہامِ باطلہ میں غلطاں و پیچاں رہیں۔ حسن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ایک نوجوان عورت جس نے ایک اہل اللہ کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ اپنے مقصدِ زندگی کے حصول کی کوشش میں ایک طویل اور تکلیف دہ اور پُر خطر سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے کے لیے اپنی ہم خیال سہیلیوں کے ہمراہ نکل کھڑی ہوتی ہے۔ اپنے آئندہ شوہر کی وہ نادیدہ عاشق ہے۔ جس کے حسن و خوبی اور کمالات ظاہری و باطنی پر بے دلیل ایمان لائے ہوئے ہے۔ قبل حصول مقصد ایک غاصب اس پر حملہ آور ہوتا ہے اور مقصدِ سفر سے اسے محروم کر دینے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بے چاری ان غاصبانہ کاروائیوں سے اسے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے اور خاموش تلقین سے اُس کی اصلاح کے درپے ہوتی ہے مگر وہ باز نہیں آتا۔ یہاں تک کہ ریوالور سے اُسے دھمکی دی جاتی ہے۔ وہ نیک بخت خاتون باوجود قدرت۔ دھمکی سے تجاوز نہیں کرتی۔ اور بجائے اس بزدل حملہ آور سے انتقام لینے کے۔ اپنی حفاظت کے لیے اپنے قتل پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ بایں ہمہ اس بدمعاش کی ناکامی اور نامرادی پر ایک نیک دل نیک بخت حور شمائل خاتون کو ترس آتا ہے۔ اور یہ سچی اور بے لوث ہمدردی کا پاک جذبہ اس پر مصائب و آلام کی بارش کا باعث ہوتا ہے۔ جسے وہ بلا یار و مددگار۔ یکہ و تنہا۔ مردانہ وار جھیلتی ہے۔ اور استقلال و ثابت قدمی کے میدان کو سر کر کے اپنے مقصود زندگی اور مایۂ حیات کو پالیتی ہے۔

پاسِ ادب ببیں کہ بکویت شہیدِ عشق
باہیئتے طپید کہ گردازز میں نہ خاست
(ادب تو دیکھ! تیری گلی میں عاشق اس انداز سے تڑپا کہ مٹی تک نہیں اُڑی۔)

اُدھر وہ بزدل غاصب اپنے مظلوم کی دہکتی آگ میں گر کر اپنے کیے کی سزا پاتا ہے۔ مگر بالآخر اس پر رحم کیا جاتا ہے۔ اور وہ دہکتی آگ اس کی معصیت کو جلا ڈالتی ہے۔ اور اسے پاک و صاف بنا کر گلزار ابراہیمی اسؑ کے لیے مہیا کر دیتی ہے۔ اس کے بعد نہ ظالم ظالم رہتا ہے۔ نہ مظلوم مظلوم۔ یہ اس پر فدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس پر۔ پھر ہوتا ہے جو کچھ کہ ہوتا ہے۔ اِنَّ فِـیْ ذَالِکَ

لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ

(اس میں اہلِ دل کے لیے نصیحت ہے۔یا کان میں پڑا اور شہید ہو گیا۔)

شاہجہاں آج بے طرح مسکراتی ہوئی آ رہی ہیں۔

شاہجہاں: ''بلقیس نے مزاج کی کیفیت دریافت کی ہے۔''

میں: ''خدا کا شکر ہے۔بالکل اچھا ہوں۔اس یادآوری کا شکریہ۔''

شاہجہاں: ''(نیچی نگاہ اور دبی آواز سے) اور مبارک باد عرض کی ہے۔''

میں: ''مبارک باد کیسی؟''

شاہجہاں: ''(اسی لہجے میں) آپ کے اور بدر منیر کے ملاپ کی۔اور شیرینی بھی طلب کی ہے۔''

میں: ''بڑی شوخ ہیں۔''

ع یہ لوکے انھیں کے لگائے ہوئے ہیں''

دوسروں کے رونے بلکنے میں انھیں کچھ مزہ آتا ہے۔

کہہ دینا کہ:۔

دیوانگی و مستی از بوئے تو می خیزد

ہر فتنہ کہ می خیزد از کوئے تو می خیزد

(دیوانگی اور مستی تیری خوش بو سے اٹھتی ہے اور فتنہ بھی تیری ہی گلی سے اٹھتا ہے۔)

شاہجہاں تو چپکے سے کھسک گئیں۔اور میں اپنے کمرے میں اسی طرح تنہا آرام دہ کرسی پر پڑا ہوا اپنے خیالات میں پھر منہمک ہو گیا۔رات کی باتیں اور سحر کی پر لطف کیفیت کی یاد دل میں تازہ کر رہا تھا۔اور جو ڈرامہ میرے ساتھ قدرت کی جانب سے پیش آ رہا تھا۔اُس پر اپنا فلسفہ بگھار رہا تھا۔اس وقت یہ بات یاد آئی کہ بنارس والے مہمان خانے میں جن بزرگ نے تھپڑ اور گوشمالی سے تواضع کی تھی اور یہاں بے ہوشی کی رات دعا دی تھی۔اُن پر اب تک نہ بلقیس نے کوئی روشنی ڈالی نہ بدر منیر نے۔معاً یہ خیال آیا کہ ہو نہ ہو وہ رشی جی کی روحانیت کے کرشمے تھے۔یہ عورتیں کس قدر زیرک وفہیم ہیں۔انھوں نے خیال کیا ہوگا کہ یہ انگریزی پڑھے لوگ ایسی باتوں کے قائل نہیں

ہوتے۔ اِلاّ ماشاء اللہ۔ پھراس کا ذکران کے سامنے لانے سے فائدہ۔ انکار کر بیٹھیں تو خدانہ خواستہ کوئی ناگوار پہلو پیدا ہو۔ یہ سوچ کر دونوں کی دونوں اس قصے کو گول کر گئیں۔ مگر یہ ان کی غلطی ہے میں تو نعوذ باللہ اتنا کافر نہیں کہ ان واقعات کا بھی انکار کر بیٹھوں جو خود میری ذات کے ساتھ پیش آچکے ہیں۔ لیجیے! وہ بلقیس آرہی ہیں آج انھیں اچھا مذاق ہاتھ آیا۔ شیرینی طلب کرنے آتی ہوں گی مگر ہیں! یہ کیا! یہ تو کچھ مغموم سی آرہی ہیں۔ ہاتھ میں ایک تار کا لفافہ بھی ہے۔ خدا خیر کرے۔

میں: ''بلقیس خیر تو ہے؟ یہ اُداس کیوں ہو۔ کس کا تار ہے؟''

بلقیس۔ ''بھائی علیل ہیں مجھے بلا رہے ہیں۔''

میں۔ ''اللہ اپنا فضل کرے جاؤ۔ اپنے بھائی کو دیکھ آؤ۔''

بلقیس: ''میرا تو اس وقت یہاں سے جانے جو جی نہیں چاہتا۔ بھائی کو اُس شافیِ مطلق کے سپرد کرتی ہوں۔ میں جا کر کیا کروں گی۔ نہ طبیب ہوں نہ ڈاکٹر۔''

میں: ''میرے لیے تو سب کچھ ہو۔ طبیب بھی اور ڈاکٹر بھی۔ اور مسیحا بھی اور ملک الموت بھی۔ اپنے سگے بھائی کے لیے خواہ کچھ بھی نہ ہو۔ مگر یہ ٹھیک نہیں۔ بھائی دنیا میں بڑی چیز ہے۔ تمھارے جانے سے وہ خوش ہو جائیں گے۔ اور تم سے اُن کے قلب کو تقویت پہنچے گی۔ جاؤ اور جب تک اُن کی حالت قابلِ اطمینان نہ ہولے، انھیں کے پاس رہنا۔''

بلقیس۔ ''آپ ارشاد فرماتے ہیں تو میں جاتی ہوں۔ اُن کی صحت کے لیے دعا فرمایئے گا۔''

میں: ''اللہ اپنے حبیب پاک ﷺ کے صدقے انھیں جلد شفا عنایت فرمایئے۔''

بلقیس: ''اگر آپ اجازت دیں تو میں نور جہاں کو اپنے ہم راہ لے جاؤ۔ شاہ جہاں اور بدر منیر یہاں آپ کی خدمت میں رہیں گی۔''

میں: ''اس میں میری اجازت کی کیا ضرورت ہے۔ تم جسے مناسب سمجھو لے جاؤ۔''

بلقیس: ''کیوں صاحب۔ اجازت کی کیوں ضرورت نہیں۔ وہ آپ کی بیوی۔ آپ ان کے میاں۔ پرائی عورت جو بلا اجازت لے جانے والی میں کون؟''

میں: ''تو نور جہاں پرائی ہیں؟''

بلقیس: ''پرائی نہیں تو کیا وہ میری بیوی ہیں؟''

میں: ''ہاں ہو سکتا ہے۔''

بلقیس: ''کیوں کر؟''

میں: ''جس طرح تم شاہ جہاں کی بیوی ہو۔ نور جہاں تمھاری بیوی بن جائیں تو کوئی تمھارا یا نور جہاں کا کیا کر لے گا۔''

بلقیس مسکرا دیں۔ مقصد میرا یہی تھا کہ تھوڑی دیر تک اسی نوعیت کی اِدھر اُدھر کی باتیں ہوں تو بھائی کی علالت کا جو غم ان پر طاری ہو گیا تھا۔ اس میں کسی قدر تخفیف ہو۔

ریل کی روانگی میں چوں کہ وقت کم تھا اور طے یہ پایا تھا کہ وہ آج ہی روانہ ہو جائیں اس لیے بلقیس اٹھیں اور اہتمامِ سفر میں مصروف ہوئیں۔ چلتے وقت مجھ سے رخصت ہونے آئیں تو یہ شعر پڑھا۔

یہ بغض تھا کہ نہ چھوڑا تمھارے کوچے میں
صبا لیے مرامشتِ غبار جاتی ہے

میں نے کہا۔

زود باشد کہ بیاید بسلامت یارم
اے خوش آں روز کہ آید بسلامت برما

(مجھے امید ہے کہ میرا محبوب بہت جلد سلامت آجائے گا۔ اس کی بسلامت آمد خوش کن لمحہ ہوگا۔)

شاہ جہاں سندر لعل کی حیثیت سے مردانہ وار ریلوے اسٹیشن تک اس جماعت کو پہنچانے گئیں۔ اور میں پھر اپنے کمرے میں لطف تنہائی کی مستیوں میں سرشار ہونے کی تمنا میں اپنا ہم نشین بن کر بیٹھ گیا۔

بدر منیر: وہ ستم رسیدہ اور فلک کج رفتار کی ستائی ہوئی بدر منیر میری تنہائی کا خیال کر کے۔ اپنے لوچ دار جسم اور لچک دار دل کو لیے ہوئے میرے کمرے میں آگئیں اور مجھ سے باتیں کرنے لگیں۔ وہی غم کی کہانی۔ وہی بھولی ہوئی باتیں۔ بھیگی بھیگی آنکھوں۔ اور ٹھنڈی ٹھنڈی سانسوں کے ساتھ شروع

ہوگئیں۔ اثنائے گفتگو میں ایک موقعہ پر انہوں نے یہ شعر پڑھا۔

تمھیں کہو کہ کہاں تھی یہ وضع یہ ترکیب
ہمارے عشق نے سانچہ میں تم کو ڈھال دیا

تو میں نے بات کاٹ کر کہا۔"بدرُو۔ اگر اجازت ہو تو میں اس شعر کو اپنی طرف سے پڑھ دوں اور ہدیہ میں پیش کروں۔"

بدر منیر:"نہیں۔ ہرگز نہیں۔ آپ اس شعر کو نہیں پڑھ سکتے۔ آپ نے اس شعر کو کوئی حق ادا نہیں کیا۔ میں نے اس کا حق ادا کیا ہے۔ میرے عشق نے آپ کو سانچے میں ڈھالا ہے۔ میری آہِ رسا نے آپ کو عرشِ دل ربائی کے بام پر پہنچایا ہے۔ میرے تارِ اشک نے آپ کے لیے پیراہنِ یوسفی تیار کیا ہے۔ میری ٹھنڈی سانسیں آپ کے لیے نسیم جاں پرور ثابت ہوئی ہیں۔ آپ کے عشق نے مجھ کو سانچے نہیں ڈھالا بلکہ میرے دل وجگر کے پرخچے اُڑا دیے۔ مجھے جلا کر خاکِ سیاہ کر ڈالا، مجھے بنایا نہیں بلکہ بگاڑا ہے، نکما کر دیا ہے۔ اس قابل ہی نہیں رکھا کہ آپ کا جی بہلاؤں۔ آپ کے سامنے مسرت آمیز باتیں کروں، نشاط انگیز روش اختیار کروں، جب حاضر ہوتی ہوں، روتی ہوں اور رلاتی ہوں۔

مَیں:"تم پر اللہ کی یہ بڑی رحمت ہے کہ اس نے ہمیں ایک دُکھا ہوا دل دیا، درد سے تمھیں بڑا حصّہ ملا ہے، مجھے تمھاری اس حالت پر رشک آتا ہے کاش تم اپنے درد میں سے ایک حصہ مجھے بھی دیتیں۔"

بدر منیر:"آپ نے صحیح فرمایا۔ درد میرا اوڑھنا بچھونا ہوگیا ہے، میری غذا بن گیا ہے، رگ و پوست میں سما گیا ہے، اب اسے میں اپنے سے الگ نہیں کر سکتی۔ اس میں کمی گوارا نہیں کر سکتی۔"

مری بے تابیاں بھی جزو ہیں اک میری ہستی کی
یہ ظاہر ہے کہ موجیں خارج از دریا نہیں ہوتیں

اتنے میں شاہ جہاں بلقیس کو ریل پر سوار کر کے واپس آئیں اور شریکِ صحبت ہوگئیں۔ بدر منیر نے فوراً گفتگو کا ڈھنگ تبدیل کر دیا۔ باوجود انتہائی یک جہتی اور رازداری کے اس جماعت کا ہر فرد جداگانہ طور پر بھی اپنے اپنے دل میں ایک جداگانہ راز رکھتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے۔

اے "ترا با ہر دلے" رازِ دگر
ہر گدا را بر درت نازِ دگر

(ہر دل کے ساتھ تیرا الگ معاملہ ہے اور ہر گدا تیرے در پر علاحدہ ناز رکھتا ہے۔)

دوپہر کا کھانا ہم تینوں نے ساتھ کھایا۔ اس کے بعد بدر منیر نے کہا" آپ کسل مند معلوم ہوتے ہیں۔ ذرا قیلولہ فرما لیجیے۔

مَیں: کسل مندی، خستگی، آرام طلبی کے دن گئے۔

رہرواں را خستگی راہِ نیست
عشق ہم راہست و ہم خود منزل است

(عشق کے مسافروں کو راستے کی پریشانی نہیں ہوتی، کیوں کہ عشق خود راہ بھی ہے اور منزل بھی۔)

لیکن تم کہتی ہو تو مَیں تھوڑی دیر کے لیے لیٹے جاتا ہوں۔"

شاہ جہاں اور بدر منیر اٹھیں اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کمرے سے باہر جانے لگیں۔ شاہ جہاں چوں کہ اسٹیشن سے آئی تھیں۔ مردانہ لباس میں تھیں۔ ایک حسین معشوق نما مرد کا کسی حسین و خوش ادا عورت کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر سامنے سے گزرنا ایسا منظر نہ تھا جسے دیکھ کر میں خاموش رہتا۔ ظرافت کے لہجے میں مَیں نے اس جوڑی کی سلامتی کی دعا مانگی اور کسی قدر پر حسرت انداز سے بارگاہ الٰہی میں التجا پیش کی کہ ایسی ہی جوڑی مجھے بھی دلا دے۔ دونوں نے ہنس کے "آمین" کہا اور آپس میں شوخیاں کرتی ہوئی نظروں سے غائب ہو گئیں۔ میں تھوڑی دیر تک تو اپنے کسی تخیل کا لطف لیتا رہا پھر پلنگ پر جا کر لیٹ رہا۔

بہ یادِ چشمِ مخمور کسے در انجمن رفتم
گرفتم ساغرِ مے بر کف داز خویشتن رفتم

(اُس خمار آلود چشم کی یاد میں محفل میں چلا گیا اور شراب کا جام ہاتھ میں لے اپنے آپ میں نہ رہا۔)

☆☆☆☆☆

(۲۰)

اے رفیق کوئے زہد از من سروسامان مجو
خاک شد درراہِ خوباں ہرسروسامان کہ بود

(اے کوچۂ زہد کے دوست مجھ سے سروسامان کا سوال نہ کر کیوں کہ وہ تو حسینوں کی راہ میں قربان کردیا۔)

یہ ہفتہ بس اسی طرح کٹا کہ ع کہے سرگشتہ، نیم گہے آشفتہ نم۔ کبھی شاہ جہاں سے چہلیں ہیں۔ اُن کے ساتھ موٹر پر ہواخوری ہوئی۔ تھیٹر دیکھے گئے۔ سینما اور سرکس کے چکر لگے۔ اور کبھی بدر منیر سے سوز و گداز کے قصّے اور گُل و بلبل کی کہانیوں کے سلسلے رہے۔ مگر کسی کے ہردم بہ لباسِ دِگر جلوہ آرا ہونے کے شوق کے قربان جایئے کہ اُس نے اس حالت کو بھی دیر تک قائم نہ رہنے دیا۔

دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے
آن میں کچھ ہے، آن میں کچھ ہے

بلقیس کو وطن گئے ہوئے آج نواں دن ہوگا کہ شاہ جہاں کی بھی طلبی کا تار آگیا۔ یوں تو خیریت کے تار روز آتے جاتے تھے۔ لیکن آج کا تار کسی قدر تفصیلی تھا۔ جن میں اُن وجوہات کی جانب اشارہ تھا۔ جو شاہ جہاں کی طلبی کا باعث ہوئے۔

میرا جی نہ چاہتا تھا کہ شاہجہاں جائیں اور میرے اجڑے ہوئے دل کا ایک کونہ اور ویران ہوجائے۔ لیکن چوں کہ یہ مفارقت عارضی تھی اور ضرورتِ سفر شدید۔ میں خود انھیں ریل پر سوار کر آیا۔ اب میں ہوں اور بدر منیر۔ اور صحبت کا وہی رنگ جو ہمارے ان کے درمیان مختص ہو چکا ہے۔ انھیں ہواخوری کا شوق نہیں نہ تھیٹر دیکھنا پسند کرتی ہیں۔ اسٹیج پر حسن و عشق کا ڈراما اُن کی کیفیات میں ناقابلِ برداشت شورش کا باعث ہوتا ہے۔ اس لیے وہ تماشے میں جا کر تماشہ بننے سے گریز کرتی ہیں۔ بالطبع تنہائی پسند واقع ہوئی ہیں۔ اور تنہائی کی صحبتیں اُن کی نہایت دلچسپ اور پرکیف ہوتی ہیں۔ شعر شاعری میں خاصہ دخل ہے۔ علاوہ اس کے کہ اساتذہ کا چیدہ چیدہ کلام بہت کچھ یاد ہے۔ خود بھی نہایت پھڑکتے ہوئے شعر کہتی ہیں۔ شعر پڑھنے کا انداز نہایت بانکا اور موثر ہے۔ شعلہ تخلص فرماتی ہیں۔ شاہجہاں کی اور ترکیب ہے اور ان کی اور ترکیب۔ لطف سے نہ یہ خالی نہ

وہ۔ اور دونوں میں تقابل میرے حدِ امکان سے باہر۔

جمال و عشق آں دلبر زہر معشوق و ہر عاشق
نگاہ و جلوہ نظارے و دیدارے دگر دارد

(اس محبوب کا حسن ہر عاشق و معشوق کی نگاہ، جلوے اور دیدار سے مختلف ہے۔)

اس زمانے میں مجھے اس کی بھی مہلت مل گئی کہ اپنے کاروبار مرحومہ کی فاتحہ خوانی سے سبکدوشی حاصل کرلوں۔ چناں چہ حساب فہمی اور تصفیہ بقایا کی ناگواریوں سے فراغت پا کر اس خشک اور خودغرضانہ زندگی سے نجات پائی۔ اور آزاد نما غلامی کی بیڑیاں پیروں سے نکال دیں۔

فارغ از دغدغۂ گبرو مسلماں کردی
اے جنوں گرد تو گردم عجب احساں کردی

(اے جنوں! مَیں تیرا طواف کروں کہ تو نے کیسا احسان کیا ہے کہ مجھے آتش پرست اور مسلمان کی فکر سے آزاد کردیا۔)

خدا خوش رکھے میرے ایک دوست ہیں جنھیں بدقسمتی سے اس موقوفی تجارت کی کہیں اطلاع مل گئی۔ بیچارے دوڑے ہوئے میرے پاس دفتر میں پہنچے اور اپنی عینک کی چمک مجھ پر پھینک پھینک کر ایک لمبا چوڑا لکچر پلانا شروع کردیا۔ آدمی نہایت معقول ہیں۔ نہایت چیٹ پٹے۔ نہایت چھوئی موئی۔ بڑے گویا۔ بڑے لسان۔ بڑے ظریف۔ بڑے عاشق مزاج فوراً ہی تو عاشق ہوجاتے ہیں۔ اور سمجھ یہ لیتے ہیں کہ معشوقیت کا مقام عطا ہوا ہے۔ پھر لطف یہ کہ معشوق سے متوقع بھی عاشقانہ برتاؤ کے رہتے ہیں۔ اس کے خلاف پاتے ہیں تو جس عجلت سے عاشق ہوئے تھے اسی عجلت سے بازگشت فرماتے ہیں۔

آدمی نہایت معقول ہیں۔ دو چار نہیں۔ دس پانچ نہیں۔ بلکہ سینکڑوں مرتبہ ایسے واقعات پیش آچکے ہیں۔ مگر وہ بدستور زندہ ہیں۔ ہمت ماشاءاللہ اتنی بلند ہے کہ بعض موقعوں پر ایک ایک دن میں تین تین عشق نبٹائے ہیں۔ صبح سے دوپہر تک ایک سے سبکدوش ہوئے۔ دوپہر سے شام تک دوسرے سے فراغت پائی۔ شام سے صبح تک اور کبھی سوتے وقت تک ہی تیسری مہم سر کرلی۔

آدمی نہایت معقول ہیں۔ پہلو میں ان کے دل نہیں۔ بلکہ ایک پرندہ ہے۔ جو ہزاروں مرتبہ اڑتا ہے اور ہزاروں مرتبہ واپس آجاتا ہے۔ باوجود اس عدیم الفرصتی کے اُن کا مادّہ ہمدردی عوام کے ساتھ بالعموم۔ اور مجھ خوش نصیب کے ساتھ بالخصوص اتنا بڑھا ہوا ہے کہ جوشِ خیر خواہی میں انھوں نے اس وقت اپنی پوری معقولات ومنقولات مجھ پر صرف کردی۔ مگر میں اتنا نالائق واقع ہوا ہوں کہ ذرا بھی تو اثر قبول نہیں کیا۔ اور ان کی تقریر کے اختتام پر بجائے اس کے کہ ان کی اس عنایت و ہمدردی کا شکریہ ادا کرتا۔'' یہ مختصر کا جواب دے کر کہ ع

ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

اُن سے بلا رخصت ہوئے اٹھ کر چل دیا۔ اُن بے چاروں کو اپنی پوزیشن کا بڑا خیال رہتا ہے۔ اُن کی عمر اب تک قیام وجاہت کی بلیغ کوشش میں صَرف ہوئی۔ اور امر بحث طلب ہے کہ اس میں انھیں کامیابی کس حد تک حاصل ہوئی۔ اس میں بھی اختلاف ہے کہ خود اُن کی نظر میں اُن کا مرتبہ کیا ہے۔ مگر اس میں کسی کو اختلاف نہیں کہ اُن کا احساس خودداری بہت بڑھا ہوا ہے۔ اور ان کا پوزیشن گویا کانچ کا ایک گلاس ہے جو ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ جاتا ہے۔ میں چوں کہ اپنے جنون میں الجھا ہوا تھا۔ اُن کی فطرت کی ان نازک پہلوؤں کو اس وقت بھول گیا اور یہ بے استغنا برت بیٹھا۔ مگر وہ آدمی نہایت معقول ہیں۔ بے چارے مجبور تھے۔ آخر کیا کرتے بگڑ بیٹھے۔

بہت برا بھلا کہا۔ انواع واقسام کے چہرے بنائے۔ انگریزی تعلیم کی مذمت کرتے رہے۔ اور کہنے لگے۔ ''مجھ سوختۂ عشق پامال محبت سے یہ شخص کہتا ہے کہ ''ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں'' میں۔ میں نے۔ میں نے پی ہی نہیں تو اتنے اچھے شعر کہتا ہوں کہ اُن کے سمجھنے اور داد دینے والے اس زمانے میں میسر نہیں۔ دیوانِ حافظ کی اتنی اچھی شرح کرتا ہوں کہ آج تک کسی نے نہ کی ہوگی۔ ڈراما نویسی میں اچھوں اچھوں کے چھکے چھڑوا دیے۔ فلسفۂ حُسن وعشق پر اتنا پر زور لیکچر دیتا ہوں کہ بمبئی کی تعلیم یافتہ خواتین میرا لوہا مانتی ہیں۔ اور یہ شخص مجھ سے کہتا ہے کہ ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں۔ اس نے میری سخت توہین کی۔ میری پوزیشن کا خیال نہ کیا۔ میرے خلوص کی بھی قدر نہ کی۔ یہ اس کا قصور نہیں۔ انگریزی تعلیم کا قصور ہے جن لوگوں کے دماغ میں یہ انگریزی خناس

گھس جاتا ہے۔ وہ اپنے مقابلے میں کسی کی کوئی ہستی ہی نہیں سمجھتے۔"

مجھے بعد میں ان باتوں کی اطلاع ملی تو میں ہنس کر چپ ہو گیا۔ اور کہا تو بس اتنا ہی کہا کہ آدمی نہایت معقول ہیں۔

زاہد ظاہر پرست از حال ما آگاہ نیست
درحقِ ماہر چہ گوید جائے ہیچ اکراہ نیست

(ہمارے حال سے ظاہر پرست زاہد آگاہ نہیں ہے۔ وہ ہمارے بارے میں جو بھی کہے، برا ماننے کی ضرورت نہیں۔)

من جملہ اور خوبیوں کے اُن میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ دل میں غبار عرصے تک نہیں رکھتے۔ بہت جلد صاف ہو جاتے ہیں۔ چناں چہ بعد میں ایک روز چوپاٹی پر مل گئے۔ میں نے اپنی اس دن کی کج خلقی کے متعلق معافی مانگی اور اپنی اصلی حالت کسی قدر تفصیل سے اُن سے بیان کی تو بے چارے خوش ہو گئے اور معاملۂ خاص میں بھی۔ اس دن سے میرے ہم درد بن گئے۔ آدمی نہایت معقول ہیں۔ مگر ایک بات سے کسی حد تک انھیں اختلاف ہی رہا۔ اس چار بیویوں کے قصے کی اُن کا فلسفہ کسی طرح تائید نہ کرتا تھا۔ میں نے کہا کہ "مجھ پر تو انگریزی کے خراب کن اثرات کی اس درجہ شکایت اور خود انگریزی خیال سے اس قدر متاثر" انھوں نے جواب دیا کہ "ہمیں انگریزی خیال مدنظر نہیں۔ میرا فلسفۂ عشق اسے جائز نہیں رکھتا۔" میں نے کہا "سبحان اللہ" اب آپ کا فلسفۂ عشق اسلام کی بھی قطع و برید پر آمادہ ہو گیا۔" آدمی نہایت معقول ہیں۔ بے چارے منہ بنا کر کچھ چپ ہو رہے۔

میں نے بھی اس خیال سے کہ کہیں پھر نہ بگڑ بیٹھیں۔ اس مسئلہ پر انھیں زیادہ نہیں چھیڑا اور چھیڑتا بھی کیا۔ شاہ جہاں کی سی پیاری پیاری باتیں آتیں اور وہ جادو میری تقریر میں ہوتا تو کہتا کہ "میاں! عشق جسے کہتے ہیں۔ یا عشق جسے کہنا چاہیے وہ کہیں مٹی کی مورتوں سے ہوا کرتا ہے۔ عشق تو اُس پاک جذبے کا نام ہے۔ جو اس کشش کو قبول کرتا ہے۔ جو کہیں سے پھینکی جاتی ہے۔ یہ صورتیں تو سب درمیانی چیزیں ہیں۔ جن سے برزخ کا کام لیا جاتا ہے۔

ہمہ رابستۂ گیسوئے پریشاں داری

غمزۂ خاص بہر گبرو مسلماں داری

مثلے ہست کہ الجنس الی الجنس یمیل

بہر دل بُردنِ من صورتِ انساں داری

(سب کو گیسوئے پریشاں میں الجھا رکھا ہے۔ ہر آتش پرست اور مسلمان کے ساتھ خاص رمز رکھتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ہر جنس اپنی جنس کی طرف مائل ہوتی ہے۔ میرا دل چھیننے کے لیے انسانی صورت میں آیا ہے۔)

جب اصلیت یہ ہے۔ اور ہمارے دل کا موہنے والا۔ بے تعداد ادائیں۔ بے شمار شانیں اور غیر محدود رعنائی و دل ربائی رکھتا ہے۔ تو اُسے کسی تعینِ خاص میں محدود و مقید کیوں کر کیا جا سکتا ہے۔

سر بمحراب از برائے سجدہ کے آرد فرود

آں کہ دارد قبلہ ہر دم طاقِ ابروے دگر

(سجدے کے لیے سر محراب میں کیسے لے جائے گا۔ اس کا تو قبلہ طاقِ ابرو ہے۔)

اور کسی تعین خاص سے اپنی دل بستگی و وابستگی کو محدود و مقید رکھ کر ایک عاشقِ صادق کیوں کر سَیری حاصل کر سکتا ہے۔

عشقِ مارا کئے بُود غایت پدید

حُسنِ جاناں چوں ندارد غایتے

(ہمارے عشق کی شدّت کیسے پتا چلے گی جب کہ حسنِ محبوب کی انتہا کوئی نہیں ہے۔)

یہ امور کتابوں سے سمجھ میں نہیں آتے۔ تقریر و تحریر اس میدان میں عاجز ہے۔ فیضانِ قدس کی بارش سے اس سرزمین میں روئیدگی ہوتی ہے اور وہیں سے گلستان کے اس بابِ پنجم کا سبق پڑھایا جاتا ہے۔ یوں ان باتوں پر اعتراض جڑ دینا تو ہر کس و ناکس کے لیے آسان ہے۔

حقیقت آج تک بُت کی نہیں معلوم زاہد کو

خدا کی شان اس پر دعوائے ایزد پرستی ہے

☆☆☆☆☆

(۲۱)

تند و پُرشور و سیہ مست ز کہسار آمد

میکشاں مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

(مے کشو! خوشی سے جھوم جاؤ کہ پہاڑوں سے تیز، پرشور اور جھومتے ہوئے سیہ بادل کثرت سے آرہے ہیں۔)

پورے دو ہفتے کی مفارقت کے بعد میری بچھڑی ہوئی بلقیس مجھ سے آملیں۔ شاہ جہاں اور نور جہاں بھی اُن کے ہم راہ واپس آگئیں۔ بڑے ساز و سامان سے آئیں۔ اور نکیلی۔ چھبیلی۔ سجیلی۔ رنگیلی۔ کٹیلی۔ لونڈیوں باندیوں کا جمِ غفیر اپنی جلو میں لائیں۔

جوش زن اے نوبہار۔ تا ہمہ مستاں شویم

شورکن اے عندلیب۔ تا ہمہ نالاں شویم

ہستیٔ مارا قضا ادوخت کتانے قبا

جلوہ کُن اے مہ لقا۔ تا ہمہ عریاں شویم

(اے بہارِ نو! جوش میں آ کہ سب مست ہو جائیں۔ اے بلبل وہ آہ و بکا کر کہ سب نالہ و فریاد کرنے لگیں۔ ہماری ہستی کو قضا نے قبا پہنائی ہے۔ اے ماہِ لقا ایسا جلوہ دکھا سب عیاں ہو جائے۔)

مگر نہیں۔ نہیں۔ ابھی نہیں۔ اس قدر تند و تیز جام کی ابھی طاقت نہیں۔ اس حسن آشکارا کی نگاہیں تاب نہ لا سکیں گی۔ اس عُریانی کی طبیعت متحمل نہ ہو سکے گی۔

عریاں تنی خوش است ولے زیبِ دیگرست

دامانِ چاک چاک و گریباں دریدہ را

(عریانی اچھی ہے مگر لباس جو دامنِ چاک اور چاک گریباں والے کی بات ہی الگ ہے۔)

یہ بڑا کرم۔ بڑا لطف۔ بڑی عنایت۔ بڑی بندہ پروری۔ بڑی عشاق نوازی ہے کہ اپنے حُسن کی گرمیاں ٹھنڈی کر کے پہنچائی جاتی ہیں۔

ایکہ برماہ از خطت مشکیں نقاب انداختی

لطف کردی سایۂ بر آفتاب انداختی

(ایک وہ جس نے چاند کو سیاہ نقاب اوڑھا دیا اور تو نے یہ کرم کیا کہ سورج پر سایہ کر دیا۔)

ہاں بلقیس اپنی سہیلیوں کے ہمراہ واپس آ گئیں۔ اُن کے بھائی خدا کے فضل سے صحت یاب ہو گئے۔ ان کی صحت یابی پر ریاست میں بڑی دھوم سے جشن منائے گئے۔ انعام تقسیم ہوئے قیدی رہا کیے گئے۔ مری طلبی پر اصرار تھا۔ بلقیس نے اپنے راز دار بھائی سے جملہ حالات بیان کر دیے۔ انھوں نے بے انتہا مسرت کا اظہار کیا۔ اور مجھ سے ملنے کا بے حد شوق ظاہر کیا۔ مگر بلقیس نے وہاں کا رنگ میری موجودہ طبیعت کے خلاف دیکھ کر میرے شریک جشن ہونے کی تجویز کو خوب سے ٹال دیا۔ راجہ صاحب کو انتظامات ریاست میں اختیارات کُلّی ملنے والے ہیں۔ انھوں نے اپنی ہم شیرہ کے ہاتھ پیغام بھیجا ہے کہ اُن سے کہنا کہ اس ریاست کو وہ اپنی ہی ریاست سمجھیں۔ یہاں تشریف لے آئیں اور امور ریاست میں میرا ہاتھ بٹائیں۔ شاہ جہاں کے بھائی بھی اس درخواست میں شریک ہیں۔ اور اپنی طرف سے حقِ وزارت نذر کرنے کو تیار۔ اس محبت میں ڈوبے ہوئے مگر دل میں وحشت پیدا کرنے والے پیام کا میرے پاس بجز اس کے اور کیا جواب تھا کہ۔

شکوہِ تاج سلطانی کہ بیمِ جان دروودرج است
کلاہِ دلکش ست امّا بدردِ سر نمی ارزد

(تاج سلطانی کی شان وشوکت جس میں جان کا خطرہ ہو، یہ سر پوش خوب صورت تو ہے مگر سر کی قیمت پر نہیں چاہیے۔)

بلقیس! تمھارا۔ تمھارے بھائی کا۔ ونیز شاہ جہاں کے بھائی کا، تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مجھ ناچیز۔ ناکارۂ محض پر اس درجہ عنایات مبذول ہیں۔ مگر۔

قصرِ جنت چہ کنم کوچۂ یارے دارم
ترسِ دوزخ نکنم روئے نگارے دارم

(جب یار کا کوچہ حاصل ہے تو جنّت کا کیا کرنا۔ جب محبوب کے چہرے کا دیدار ہو رہا ہے تو دوزخ کا کیا خوف۔)

اب کہاں میں اور کہاں انتظاماتِ ریاست۔ کہاں یہ بدمستیاں اور کہاں دربارداری کی

قیود و پابندیاں۔ نہ جاہ و منزلت کا ولولہ باقی ہے۔ نہ حکومت کا شوق۔ نہ دولتِ فانی جمع کرنے کی ہوس۔

حاجتم ہیچ نباشد بزر و گوہر و سیم
فقر من رتبہٗ اقبال سکندر دارد

(مجھے سونے چاندی اور قیمتی ہیروں کی ضرورت نہیں۔ میرا فقر سکندر جیسا مرتبہٗ اعلا رکھتا ہے۔)

یہ تمنائیں دل میں باقی ہوتیں تو ایک جمے جمائے منفعت بخش کاروبار کا کیوں ایک ٹھوکر سے خاتمہ کر دیتا، برسوں کی پیدا کردہ عزت و آبرو کو ان دو چھلکتے ہوئے ساغروں میں کیوں غرق ہونے دیتا۔ اپنی خودداری اور اپنے ہوش و حواس کے بے خودی مدہوشی اور گم نامی کے بدلے کیوں فروخت کر ڈالتا۔ اب تو نہ کوچہٗ یار مجھ سے چُھٹ سکتا ہے۔ نہ یار کے پہلو میں بیٹھ کر کسی اور جانب توجہ ہو سکتی ہے بس یہی دعا کرو۔ ع

کہ ایں آوارہ کوئے بتاں آوارہ تر بادا
(یہ آوارہ حسینوں کی گلی میں اور آوارہ ہو جائے گا۔)

ان ریاستوں کے قصوں کو چھوڑو۔ کچھ اپنی کہو کچھ ہماری سنو۔

ما سرخوشیم بادہٗ ما در پیالہ کن
بدمست را بہ غمزہٗ ساقی حوالہ کن

(ہم سرخوشی میں ہیں ہماری شراب جام میں ڈال دے۔ بدمست کو ساقی کے غمزے کے حوالے کر دے۔)

”بی، شاہ جہاں بیگم؟ تم اچھی رہیں؟ سفر خیر و خوبی سے طے ہو گیا؟ اور نورِ جہاں بیگم تو خیریت سے ہیں؟“

شاہ جہاں: ”جی ہاں۔ خدا کا شکر ہے۔ خیریت سے ہیں۔ اپنی محرومی کی شاکی ہیں۔ کئی مرتبہ اپنے ملال کو ظاہر کر چکی ہیں کہ کچھ ایسے واقعات پیش آتے رہے کہ اب تک آپ کی قدم بوسی کا شرف حاصل نہ کر سکیں۔ میں نے انھیں آج صبح ریل ہی میں یہ دل خوش کن امید دلائی تھی کہ آج انھیں اپنی دیرینہ تمنا بر لانے کا موقعہ ہاتھ آئے گا۔ بے چاری سُن کر چپ ہو گئیں۔ اور شرما کر گردن جھکا لی۔“

میں: "تو یہ مجھے اپنی آج کی خدمات کے متعلق نوٹس مل رہا ہے بہت بہتر میں حاضر ہوں۔"

فردا کہ دوست کشتۂ خود را ندا کند

خیزد خاک و بارِ دگر جاں فدا کند

(جب کل دوست خود اپنے مارے ہوئے کو پکارے گا تو وہ خاک سے اُٹھ کر دوبارہ پھر اپنی جان نچھاور کر دے گا۔)

☆☆☆☆☆

(۲۲)

اے ترا بر طور دل ہر دم تجلائے دگر

طالبِ دیدار تو ہر لحظۂ موسیٰ دگر

(اے محبوب! تیرا جلوہ ہر دم دل کے طُور پر ہوتا ہے۔ تیرے دیدار کا طالب ہر ساعت ایک اور موسیٰ ہوتا ہے۔)

آ جا! میرے چھبیلے۔ میرے طرح وار۔ آ جا! میرے دل میں پٹھکیاں لینے والے۔ گدگدیاں کرنے والے۔ میرے سینے میں آگ لگانے والے۔ میرے کلیجے کی ٹھنڈک۔ آ جا۔ مجھے بے چین کرنے والے۔ تڑپانے والے۔ بے قرار رکھنے والے۔ میرے لب کا سکون۔ میرے دل کا چین۔ میرے دل کا قرار۔ آ جا! مجھے آنکھیں دکھانے والے۔ ڈرانے والے۔ دھمکانے والے۔ چشمِ مست میں ڈبونے والے۔ آبِ زلال کا شربت پلا پلا کر مجھے تقویت دینے والے۔ میرے مونس۔ میرے غم گسار۔ آغوشِ رحمت میں لوریاں دے دے کر مجھے سلانے والے۔ مجھ سے روٹھنے والے۔ مجھے منانے والے۔ میرے قاتل۔ مجھے قتل سے بچانے والے۔ میرے مارنے والے۔ مجھے جلانے والے۔ آ جا!

بے حجابانہ در آ از کاشانۂ ما

کہ کسے نیست بجز دردِ تو در خانۂ ما

(ہمارے آشیانے میں بے حجاب آجا، کیوں کہ ہمارے گھر میں تیرے درد کے سوا کوئی بھی نہیں۔)
بادل کی گرج بجلی کی چمک۔ برسنے والے۔ دمکنے والے۔ بادِ صبا کے گھوڑے پر سوار ہوکر نکہت گل کی نقاب منہ پر ڈال کر گل گشتِ چمن میں خرامِ ناز کے جلوے دکھانے والے۔ آفتاب و ماہ تاب کے روزنوں میں سے جھانکنے والے۔ گرما دینے والے۔ ٹھنڈک پہنچانے والے۔ اپنی عظمت و بلندی کے آسمانوں کو غمزہ و ناز و عشوہ و انداز کے ستاروں اور سیاروں سے رونق دینے والے، حسن مطلق کو مقید کر کے دکھانے والے ٹکڑے کر کر کے منتشر کرنے والے، حسینانِ جہاں کے نظامِ عالم کو درہم و برہم کر دینے والے، حُسن کی اوٹ میں اپنے رُخِ زیبا کو چھپانے والے۔ میرے چنچل، میرے انوکھے بہروپئے، جس روپ میں تیرا جی چاہے۔ جس رنگ میں تو آنا چاہے۔ منہ کھولے ہوئے یا چھپائے ہوئے۔ چادر لپیٹ کر۔ یا برقع اوڑھ کر۔ جس شان میں تیرا جی چاہے۔ آجا!۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت رامی شناسم

(تُو جس رنگ کا لباس بھی زیبِ تن کر لے۔ تجھے تیرے قد سے پہچان لوں گا۔)
میری آنکھوں نے تیرے لیے چھڑکاؤ کر رکھا ہے تا کہ راستے کا گرد و غبار باعثِ تکدر نہ ہو۔ میرے کان تیری آہٹ پر لگے ہوئے ہیں۔ اور ہر آواز پر تیرا ہی گمان کرتے ہیں۔ میرا دل تنہائی اور تخلیے میں بیٹھا ہوا بے چینی سے تیرا انتظار کر رہا ہے۔

بیا بر چشمِ عاشق کن تجلی روئے زیبا را
کہ جز وامق نداند کس کمال حسن عذرا را

(آجا اور چشمِ عاشق کو اپنے چہرۂ پُر نُور کی تجلی دکھا۔ کہ عذرا کے کمالِ حسن سے وامق کے سوا کوئی واقف نہیں۔)
میری پیاری نور جہاں! میں نے تجھے پہچان لیا۔ تو میری ہم وطن ہے۔ میرے محلے کی رہنے والی ہے۔ میرے باپ کی گود میں تو نے کھیلا ہے۔ میں اور تو دونوں برسوں ساتھ کھیلے ہیں۔

ہم دونوں مٹی کے گھروندے بنایا کرتے تھے۔ مینہ برستا تھا تو باہر بھاگ جاتے تھے۔ اور پانی میں کھیلا کرتے تھے۔ میرا باپ بازار سے کوئی کھانے پینے کی چیز لاتا تو اس میں سے تیرا حصّہ میں چُرا لیتا اور چُھپا کر رکھ چھوڑتا۔ جس دن تو بیمار ہو جاتی اور باہر نہ نکلتی اس دن میں بھی اپنا کھیل موقوف کر کے تیرے لیے اُداس رہتا۔ اور تیری صحت کے لیے لوگوں سے چھپ کر اپنے ننھے ننھے ہاتھ اٹھا کر بارگاہِ اقدس میں دعا کرتا۔

میرے بچپن کی گوئیاں! تو کہاں مجھے روتا بلکتا چھوڑ کر اچانک چلی گئی تھی۔ تیرے چلے جانے کے بعد میں بہت مغموم رہا نیند جاتی رہی، بیمار ہو گیا۔ ساتھ کھیلنے والا کوئی نہ رہا۔ جب کسی دوسرے بچے کو دیکھتا تو یاد آ جاتی اور مجھے اُداس کر جاتی۔ ابا کوئی چیز بازار سے لاتے تو تو پھر یاد آتی۔ چند روز خواب میں تو میرے ساتھ آ کر کھیلتی رہی۔ پھر خواب میں آ کر کھیلنا بھی تو نے چھوڑ دیا۔ جس مکان میں تو رہا کرتی تھی اُس کے دروازے کا جب موقع پاتا چکر لگا آتا۔ مگر تیرے باپ کے چلے جانے کے بعد اُس مکان میں کوئی ایسا بُرا شخص آ کر رہا کہ میں وہاں جاتا تو وہ مجھے غصے سے دیکھتا اور بعض وقت جھڑک دیتا۔ اس لیے مجھ سے وہاں کا جانا بھی چھوٹ گیا۔ بہت دنوں میں جا کر کہیں تیری یاد کم ہوئی۔ مگر عید بقرعید کے دن اور شبِ برات کے پٹاخوں میں تو ہمیشہ یاد آتی رہی۔ تو کہاں چلی گئی تھی۔ اور میرے پڑوس سے اس پردیس میں کیسے پہنچی۔

نور جہاں: "تنگیِ معیشت اور افکارِ زمانہ سے پریشان ہو کر میرے ابا پردیس نکل کھڑے ہوئے۔ ادھر ادھر ناکامیوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ بالآخر اس ریاست میں آ نکلے۔ خدا بلقیس کے والد مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ بڑے مردم شناس تھے۔ انھوں نے ابا کی بڑی قدردانی فرمائی۔ چند ہی روز میں ہم لوگوں کی حالت سنبھل گئی۔ اور خدا نے عزت، شہرت، دولت، آسودگی غرض کہ سب ہی کچھ عطا فرمایا۔ راجہ صاحب مرحوم کے دل میں ہم لوگوں کی جو قدر و منزلت تھی اس کا مزید ثبوت انھوں نے پیوند خویشی سے دیا۔ میرے ابا کی چھوٹی ہمشیرہ اُن سے منسوب ہوئیں۔ یعنی میری پھوپھی بلقیس کی سوتیلی والدہ ہیں۔ میں نے اور بلقیس نے ایک ہی جگہ پرورش پائی۔ سفر میں بھی ہم سب ساتھ رہے۔ مجھے اپنا بچپن یاد ہے۔ وہ سب باتیں یاد ہیں جو ابھی آپ نے

بیان فرمائیں۔ مجھے بھی آپ سے بچھڑنے کا بے حد افسوس تھا۔ مگر بے بس تھی۔ امید ہی نہ تھی کہ آپ سے کبھی ملاقات ہو۔ جس دن اول مرتبہ آپ یہاں تشریف لائے، میں نے آپ کو دیکھا اور دیکھتے ہی پہچان لیا۔"

میں نے غور سے نور جہاں کو دیکھا اور کہا۔ "ہاں۔ واقعی تم نے مجھے اُسی دن دیکھ لیا تھا۔ تمھارے گلے میں جادو ہے۔ اور تمھارا ایک نام چمیلی بھی ہے۔ تم یہاں کی خادمہ بھی ہو اور بیگم بھی۔"

نور جہاں مسکرائیں اور کہا: "میں چمیلی نہیں ہوں۔ میں تو نور جہاں ہوں۔ آپ نے کسی اور کو دیکھا ہوگا۔"

میں: "نہیں میں نے کسی اور کو نہیں دیکھا۔ میں نے اُسی کو دیکھا جو اس وقت میرے سامنے بیٹھی میرے بچپن کی یاد کو تازہ کر رہی ہے۔ تم لوگ سب کے سب بڑے بہروپیے ہو۔ پکّے ایکٹر ہو۔ سب نہیں تو شاہ جہاں اور تمھارے ایکٹر ہونے میں تو ذرا شبہ نہیں۔ ع

من اندازِ قدت را می شناسم

(مَیں تیرے قد کے انداز سے واقف ہوں۔)

یہی ناگن اس رات طبلہ کی جوڑی لیے کوئل کی طرح کوک رہی تھی۔"

نور جہاں برابر مسکراتی رہی۔ بالآخر گردن جھکا کر کہنے لگیں۔ "آپ نے خوب پہچانا۔ اس خدمت پر میں مامور تھی۔ قصہ یہ تھا کہ بلقیس اور شاہ جہاں نے مناسب نہ سمجھا کہ قبل نکاح کسی خادمہ یا ماما کو شریک راز کیا جائے۔ چوں کہ ایک خدمت گار کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنے آپ کو پیش کر دیا اور دو تین دن آپ کی خدمت گذاری کا لطف لیتی رہی۔ چونکہ خدمت گارانہ حیثیت سے پیش ہونا مقصود تھا کسی حد تک خدمت گارانہ وضع بھی اختیار کی گئی تا کہ آپ کو مجھ سے خدمت کے مطالبے میں کوئی تکلیف نہ ہو۔"

میں: "میں کہتا نہ تھا کہ تم لوگ پکے ایکٹر ہو۔ خیر خدمت گارانہ وضع جو تم نے اختیار کی وہ تو کی۔ یہ بتلاؤ رنگت میں کیوں کر فرق آ گیا تھا۔ رنگت کا فرق تھا یا کہ میری آنکھوں کا قصور۔ اس وقت تم مجھے سانولی دکھائی دیں۔ اس وقت تمھارا رنگ دمکتا ہوا چمپئی نظر آ رہا ہے۔ اس نظر فریبی پر سے تو ذرا پردہ اٹھاؤ۔"

نور جہاں پھر مسکرائیں اور بولیں۔ ''دونوں باتیں صحیح ہیں۔ کسی قدر رنگ میں بھی تغیر تھا۔ اور کسی قدر آپ کو بھی مغالطہ ہوا۔ اس وقت بجلی کی روشنی میں شاہ جہاں کے چمکدار حسن کے سامنے میں آپ کو میلی نظر آئی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میں عمداً گوشے منہ اور ہاتھوں پر ایک تاریک پیسٹ لگالیا تھا۔ شاہ جہاں کو تھیٹر کے شوق کی بدولت ایسی باتیں بہت آتی ہیں۔ اُن کے پاس طرح طرح کے سامان رہا کرتے ہیں۔ جن سے چہرے کے رنگ وروغن میں جب چاہتی ہیں تغیر پیدا کرلیا کرتی ہیں۔ انھوں نے بھی مجھے خادمہ بنانے میں اپنی کسی قدر لیاقت صرف کی تھی۔''

میں۔ ''ایک اور بات بھی تو ہے۔ اس کا تم نے ذکر ہی نہیں کیا کہ شبِ عروسی کے انوار نے بھی تو تم پر اس وقت جوبن برسانا شروع کردیا ہے۔''

اس پر اس عروس نے شرما کر گردن جُھکا لی۔ غرض کہ میری بچپن کی گوئیاں سال یا سال کی مفاقت کے بعد مجھ سے آملیں خدا بلقیس کو جزائے خیر دے جن کی بدولت بچھڑے ہوئے مل رہے ہیں اور بھولی ہوئی داستانیں یاد آرہی ہیں۔

نور جہاں کی طبیعت میں اب تک وہی سادگی ہے جو بچپن میں تھی۔ اور جس نے ایک چھوٹے سے لڑکے کو کھیلتے کھیلتے اپنا گرویدہ کرلیا تھا۔ انکسار اُن کا حُسن ہے۔ سادگی اُن کا زیور، تکلّف سے بری، تصنع سے پاک، غریب گھرانے سے نمودار ہوئیں۔ امیر گھرانے میں آکر چمکیں۔ اور ایک غربت نصیب کے کلیجے کی ٹھنڈک بن کر اپنی بقیہ زندگی کے دن گزارنے لگیں جب کبھی سادے کپڑوں میں دیکھا۔ شگفتہ پایا۔ جب پُر تکلّف قیمتی زرق برق لباس زیب تن کیا معلوم ہوا کہ کسی بوجھ کے نیچے دبی جاتی ہیں۔

وہ سر سے پاؤں تک تصویر ہیں بیساختہ پن کی
سنورنے سے بگڑتے ہیں، بگڑنے سے سنورتے ہیں

ان کے کمرے کا نقشہ یہ ہے کہ نہ وہ زیب وآرائش ہے جو پہلے کمروں میں دیکھی گئی۔ نہ وہ زیادتی ساز وسامان۔ بلکہ ایک طرف ایک مسہری بچھی ہے۔ جس پر سادہ سفید مچھر دانی لٹک رہی ہے۔ ایک گوشے میں لکڑی کی چوکی ہے۔ جس پر مُصلاّ پھیلا ہوا ہے۔ دوسرے کونے میں ایک مختصر

سی میز ہے جس پر لکھنے پڑھنے کا سامان قرینے سے ترتیب دیا ہوا ہے۔اس کے علاوہ کمرے میں چاروں طرف الماریاں ہی الماریاں ہیں جن میں کتابیں چُنی ہوئی ہیں۔کمالاتِ ذاتی کو دیکھا جائے تو علمِ موسیقی میں تبحر اور گلے بازی کے کرشمے تو اوّل ہی روز دیکھ چکا ہوں۔مگر اس شوقِ نغمہ سرائی کے دوش بدوش ذوقِ علمی میں اپنی ہم جیسوں پر فوقیت ایک قابلِ فخر خوبی ہے۔جس پر جس قدر رشک کیا جائے بجا ہے۔

حافظِ قرآن ہیں اور کلامِ پاک کو اس قدر مست مصری لہجے میں پڑھتی ہیں کہ دنیا و مافیہا کا ہوش نہیں رہتا۔عربی میں بے تکلف بات چیت کر لیتی ہیں۔احادیث نبوی ﷺ بکثرت یاد ہیں اور اتنی اچھی یاد ہیں کہ بسا اوقات راویوں تک کے نام لے دیتی ہیں۔فقہی مسائل نوکِ زبان ہیں۔ایک اچھے خاصے مولوی کی استعداد رکھتی ہیں۔تاریخ اسلام پر گہری نظر ہے۔اور مسلمانوں کے مدوجزر کے متعلق چند عجیب وغریب خیالات کا اظہار فرمایا کرتی ہیں۔جو یقیناً قابل غور ہیں۔ اولیاءاللہ کے ملفوظات اور تذکروں کا اس کثرت اور اس توجہ سے مطالعہ کیا ہے کہ جب اہل اللہ کی باتیں کرتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اُن کی صحبت کی رات دن کی بیٹھنے والی ہوں۔صوم وصلات کی پابند تہجد، اشراق، چاشت، اوّابین، کثرتِ نوافل، ذکر و شغل ریاضت ومجاہدہ کی شوقین۔

الٰہی! تیری قدرت بہت وسیع ہے۔تو نے کوئی ایسا بھی انسان پیدا کیا ہے۔جس کے پہلو میں دل ہو اور اس دل میں تڑپ جانے کی قابلیت۔مگر ان تجلیات کی بارش سے متاثر نہ ہو۔غرض یہ نور جہاں ملیں خوب۔مجھے ان کی ضرورت تھی۔بے انتہا ضرورت تھی۔یہ نہ ملتیں تو میں گھبرا گیا ہوتا۔منتشر الحواس ہو جاتا۔تسکین وتمکین وتقویت وطمانیت کا جو سامان میرے اللہ نے میرے لیے میری نور جہاں میں مہیا فرمایا ہے۔اس کا میں سخت محتاج تھا۔جس معتدل وتسکین دہ روش کا میرے اور اُن کے درمیان اول روز سے کھاتا پڑ گیا ہے۔اس کی میں اس وقت سخت ضرورت محسوس کر رہا تھا۔میرے اس دورِ جدید کے اچانک ڈرامے نے جو پے در پے اور مسلسل بجلیاں مجھ پر گرائی تھیں۔اور جو جھٹکے میرے دل و دماغ پر پہنچے تھے۔اُن کے خیرہ کر دینے والے اور تھکا ڈالنے والے اثرات سے ہٹ کر تھوڑی دیر کے لیے ایک پُر امن وقفہ کی ضرورت تھی۔اس

ضرورت کو میرے طفولیت کی یار۔ میری سلیم الطبع اور اعتدال پسند نور جہاں نے نہایت خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ پورا کر دیا۔

یہاں کوئی چیخ تھی نہ بے ہوشی۔ بھونچکا۔ بلکہ ایک گہرے دریا کا سکون تھا۔ ایک شاندار اور پُر عظمت مگر بے تکلفی پیدا کرنے والی سادگی تھی۔ وہ کیفیات۔ ان کیفیات سے لطف و دل چسپی میں مختلف ہیں۔ وہ لطف یہاں میسّر نہیں۔ اور یہ لطف وہاں میسر نہیں۔ مگر دونوں اپنی اپنی جگہ خوب اور نہایت خوب۔ دونوں اپنے اپنے ٹھکانے مناسب اور نہایت موزوں۔ اور دونوں اپنی اپنی ذات سے بے انتہا ضروری اور نہایت شدت سے اٹل۔ شیون الٰہی کیسے شاندار مظاہر اور کیسی کیسی انوکھی اور عجیب و غریب انوٹوں میں اپنی بے مثلی اور بے مثالی کے کرشمے دکھاتی ہے۔

ذرا غور فرمایئے گا کہ چار بیویاں، چاروں سے نسبت، چاروں سے نکاح، چاروں میں جھلک مختلف۔ ہر جھلک اپنی ذات میں فرد۔ اپنی حقیقت میں کامل۔

بدر منیر میں جلال کی شان غالب۔ اس جلال میں جمال کی ٹھنڈی شعاعیں نمودار۔ بلقیس میں جمال کی شان غالب۔ مگر اس جمال کی تہہ میں انتہا درجہ کا جلال پوشیدہ۔ شاہ جہاں میں جلال و جمال دونوں کا ظہور۔ مگر ایک نسبت مختص۔ ایک نسبت راز و نیاز کی چادر میں لپٹا ہوا اور مجھی پر۔ صرف مجھی پر متجلی۔ نور جہاں میں عبدیت کی شان کا غلبہ۔ سب کچھ۔ پھر کچھ نہیں۔ کچھ نہیں مگر سب کچھ۔ ان جملہ کیفیات میں سے ایک بھی کیفیت ایسی نہیں جو خالی از لطف ہو۔ مہمل ہو یا غیر ضروری ہو۔

عشق سرتا پا غم آمد لیک اندر ہر غمے
ذوقِ دیگر لذتِ دیگر سرورِ دیگرست

(عشق سر سے پاؤں تک غم ہے مگر ہر غم کا ذوق، لذّت اور سرُور علاحدہ ہے۔)

☆☆☆☆☆

(۲۴)

ہر زماں شورِ دگر دارم ز تو

ہر نفس لب تشنہ تر وارم ز تو

(تیری خاطر ہر وقت کشمکش کا شکار رہتا ہوں اور ہر گھڑی تیری طلب کی تشنگی رہتی ہے۔)

ہاں۔ ہاں۔ یہ میں ہوں۔ میں ہوں جو کہہ رہا ہوں کہ ستم رسیدہ ہوں، آفت نصیب ہوں، مصیبت زدہ ہوں، مجھے مسلا جا رہا ہے، کچلا جا رہا ہے، پیسا جا رہا ہے، میں فریاد کرتا ہوں، شور مچاتا ہوں، چیختا ہوں، چلاّ تا ہوں، مگر کس کے آگے؟ کس سے فریاد ہے؟ کس کی فریاد ہے؟ کس کے سنانے کو یہ چیخ پکار ہے؟

ہائے! افسوس! چُپ ہونا پڑتا ہے۔ کوئی جواب نہیں، نہیں۔ مجھ پر کوئی ستم نہیں کرتا۔ کسی کی طرف سے زیادتی نہیں۔ میں خود اپنے پر ستم کرتا ہوں۔ میرا ہی وجود مجھ پر ان زیادتیوں کا باعث ہے۔ میری ہی توہمات مجھے مسلتے ہیں۔ کچلتے ہیں۔ برباد کرتے ہیں۔ مگر میں نے کب شکایت کی۔ کس سے شکایت کی؟ کس کی شکایت کی۔

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں

ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں

وہ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے فراموش نہ کر۔ نظروں سے اوجھل نہ ہونے دے۔ میرے ساتھ قصہ ختم نہ ہونے پائے۔ بلکہ مشقِ ناز جاری رہے۔ زخم ہرے ہوتے رہیں۔ ان گلشن آرائیوں میں ترقی رہے۔

چہ خوش است قتلِ عاشق کہ زتست جانِ جاناں

بفدائے لطفِ تیغت طلبد ہزار سرہا!

ہاں۔ تو پھر دور چلتا رہے۔ وقت ضائع نہ ہونے پائے۔ اس طویل وقفے کی ضرورت نہیں۔ اگر دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن کا آنا لازمی ہے۔ تو سکون کے بعد اضطراب اور اضطراب کے بعد سکون کا تسلسل بھی ضروری ہے۔

نور جہاں کے چند روزہ التفات سکون بخش نے مجھے تازہ دم کر دیا ہے۔ حوصلے بڑھا دیے ہیں۔ ہمتیں بلند کر دی ہیں۔ عدمِ استطاعتِ برداشت کا اندیشہ جاتا رہا۔ تشنگیِ کاوشِ مژگان بڑھ رہی ہے تیرے ترکش میں تو بے شمار تیر ہیں۔ اپنی جدّت نمائی کا شوق جنبش میں لا، نئے نئے تیر مجھ پر برسا۔ میرا سینہ ان تیروں کے لیے سپر بنا ہوا تیری جانب للچائی نظروں سے تک رہا ہے میری گردن تیرے خنجر آب دار کے شوق میں جھکی ہوئی ہے۔

یہ سینہ ہے، یہ جگر ہے، یہ دل ہے
بسم اللہ، اگر خیال ہے تلوار آزمانے کا

یہ توقف کیوں ہے؟ انتظار کس بات کا ہے؟ کیا شمشیر بلقیس کو تیز کیا جا رہا ہے۔ وہ تو پہلے ہی سے تیز ہے۔ پردۂ بلقیس میں تیری شمشیر برق افشاں ایک عرصے سے اپنی چمک دکھا رہی ہے مگر ترساتی ہے، گلے نہیں لگاتی۔ یہ شہادت کا جوڑا ہے مجھے آج کیوں پہنایا گیا ہے؟ میرے بناؤ سنگار کی آخر کیا ضرورت پیش آئی؟ کیا میں صدقے کے لیے تجویز ہوا ہوں؟ تو زہے نصیب مجھے آج غسل کا حکم دیا گیا ہے۔ ہدایت ہوئی ہے کہ نکاح کا جوڑا پہنوں۔ بلقیس بھی اُسی عروسی زرق برق لباس میں اپنے دہکتے ہوئے حُسن کی شعاعیں پھینکتی ہوئی اور اِدھر اُدھر نُور برساتی ہوئی چلی آ رہی ہیں۔

ایں توئی یا بخوابِ می بینم
یا بشب آفتابِ می بینم

(یہ تُو ہی ہے یا مَیں خواب میں ہوں یا رات میں سورج دیکھ رہا ہوں۔)

میرا دلِ پُر اضطراب کیوں اچھل رہا ہے۔ پہلو سے نکلا جاتا ہے۔ اور کسی کے قدموں پر گرنے اور تڑپنے کے لیے لوٹ پوٹ ہو رہا ہے۔ بلقیس! یہ آج کیا تقریب ہے؟ حشر تو سنا ہے دن میں برپا ہوگا۔ شب میں یہ قیامت خیز سماں کیسا؟

شوخی ہے قیامت تری مستانہ ادا میں
فتنے نے قدم چوم لیے لغزشِ پا میں

کوئی جواب نہیں ملتا۔ بلقیس کے لب ہائے حیات بخش پر اس وقت مہرِ سکوت ہے۔ آتی ہیں

اور خاموش کھڑی ہوجاتی ہیں۔ مجھے سر سے پیر تک دیکھتی ہیں اور چپ ہیں نگاہِ گرم سے دیوانہ بناتی ہیں اور بولتی نہیں ہے۔

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا
پُرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہاتھ میں ہاتھ لیتی ہیں اور مجھے اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔ ایک نہایت وسیع اور شاندار کمرہ ہے۔ جس کی زیب و آرائش میں انتہا درجہ کی خوش مذاقی کا ثبوت جھلک رہا ہے۔ اس میں ایک دربار منعقد ہے۔ دربار کیا ہے۔ چمنستانِ رعنائی کھلا ہوا ہے، حُسن کا دریا موجیں مار رہا ہے، کیف و مستی کی بارش ہورہی ہے، ذوق وشوق کے چشمے اُبل رہے ہیں، مگر دربار نہایت باقاعدہ اور نہایت شان دار ہے۔ درمیان میں تخت ہے۔ جس پر مرکزی حیثیت بظاہر یہ پیکرِ خاکی بایں گمنامی و بے نشانی بایں تہی دستی و بے سروسامانی، اختیار کیے ہوئے ہے۔ ایک جانب بلقیس اور اُن سے متصل بدرِ منیر۔ دوسری جانب شاہ جہاں اور اُن سے متصل نور جہاں بشکل ہلال صفِ مدور بنائے ہوئے جلوہ آرائے تخت ہیں۔ سامنے اُن شوخ چشم شیریں دہن نازک بدن پری پیکر بتانِ ماہوش کے پرے جمے ہیں۔ جنھیں بلقیس اس مرتبہ اپنے ہم راہ وطن سے لائی ہیں۔ یہ تقریب آج بلقیس ہی کی طرف سے ہے اور یہ دربار ایک منّت ہے جو وہ اپنی کسی مراد کے برآنے پر پوری کررہی ہیں۔

لطف نظری اور کیف وسرور کے اعتبار سے یہ دربار اپنی شان میں بے مثل ہے۔ چند خصوصیات ہیں جو میں نے اس سے قبل کسی دربار میں نہیں دیکھیں۔ کرسی نشینانِ دربار سب کی سب عورتیں، نقیب، چوبدار، خدمتگار۔ مورچھل بردار سب عورتیں، عطر پان تقسیم کرنے، پھول برسانے ہار پہنانے اور گلاب پاشی کی خدمت سب عورتوں کے سپرد۔ سارے دربار میں سوائے ایک کے سب عورتیں۔ پھر لطف یہ کہ سب حسین۔ سب طرح دار۔ سب نگیلی چھبیلی۔ اس پر طرہ یہ کہ ہر حسین کسی خوبی خاص میں فرد۔ رعنائی کی کسی شان خاص سے مختص کسی کو قد و قامت پر ناز۔ کسی کو تناسب اعضاء پر فخر کسی کے خط و خال خوب۔ کسی میں چھب اچھی۔ کسی کا رنگ و روغن۔ چمک دار کسی کی ادائیں دل میں گھر کرتی ہیں۔ کسی کے گلگونہ عارض پر نگاہ پھسلتی ہے۔ کسی کے کاکل

وگیسو میں نظر الجھتی ہے۔ کسی کی چاہِ ذقن غوطے کھلاتی ہے۔ کسی کی چشم مست ڈبوتی ہے۔ کسی کی لب ودندان پر پھول کی پنکھڑی اور موتیوں کی لڑی کا گمان ہوتا ہے۔ کسی کا برقِ تبسم بات بات پر بجلی گراتا ہے۔ کسی کی گفتار شیریں کسی کی رفتار ایسی کہ فتنے پسے جاتے ہیں۔ کوئی ظرافت میں طاق کوئی حاضر جوابی میں مشاق، کسی کا مذاقِ لباس قابلِ داد، کسی کا انتخابِ زیور قابل تعریف۔

دامانِ نگہ تنگ گلِ حُسن تو بسیار
گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

(تیرے حسن کے پھول بہت زیادہ ہیں مگر نظر کے دامان تنگ ہیں۔ تیری بہار کے گل چیں کو تنگ دامنی کا شکوہ ہے۔)

گویا حسن وعشق کی ہر طرف سے بارش ہو رہی ہے۔ حسن سے عشق پیدا ہوتا ہے، نہیں، عشق، حسن کو وجود میں لاتا ہے، نہیں۔ حسن وعشق میں دشمنی ہے، نہیں۔ ان دونوں میں دوستی ہے، نہیں۔ دوستی کے لفظ سے غیریت کی بو آتی ہے۔ اور یہاں غیریت کا وہم وگمان تک نہیں۔ حسن و عشق ایک ہیں۔ ایک ہی چیز کے دو پہلو ہیں، دو نام ہیں۔

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے

اس آئینے میں آکر عشق اور اس آئینے میں جا کر حُسن کا نام اختیار کرلیا جاتا ہے۔ یہاں عشق کی بے تابیاں نمودار ہونے لگتی ہیں۔ وہاں حُسن کی جہاں سوزیاں اور بے نیازیاں عالم آشکارا ہوتی ہیں۔

حسن خویش از روئے خوباں آشکارہ کردہ
پس بچشمِ عاشقاں خود را تماشا کردہ

(اپنے حُسن کو حسینوں کے چہرے میں ظاہر کیا پھر عاشقوں کی آنکھ سے خود کو دیکھ رہا ہے۔)

یہاں اس وقت دونوں کیفیتیں برس رہی ہیں۔ دیکھنے اور دکھانے کا کام یکساں مستعدی سے جاری ہے۔ پرکھنے اور پرکھانے کا بازار گرم ہے۔

وہ آمادہ سنورنے پر، ہم آمادہ ہیں مرنے پر
ادھر وہ بن کے بیٹھے ہیں، ادھر ہم تلکے بیٹھے ہیں

کوئی چیز بھی تو حسن سے خالی نہیں۔ جاندار و متحرک ہستیاں اگر حُسن کے تیز شراروں سے بھبوکا بنی ہوئی ہیں۔ تو بے جان اور بے حس و حرکت اشیا بھی اس حُسن کی بھینی شعاعوں سے دل کشی اور دل آویزی کا جامہ پہنے ہوئے ہیں۔

روشنی کے اہتمام میں غیر معمولی جدّت سے کام لیا گیا ہے۔ چھت کا رنگ آسمانی ہے۔ اس میں برقی روشنی کے فانوس ہائے بلوریں۔ ستاروں کی طرح جڑے ہوئے انواع و اقسام کی شعاعیں اور رنگ برنگ کی روشنیاں پھیک رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ دربار صرف کثیر اور کئی دن کی کوشش متواترہ کا نتیجہ ہے۔ روشنی کو اس خوبی سے ترتیب دیا گیا ہے کہ جن خاتون کے سپرد اس کا اہتمام ہے وہ جب چاہتی ہیں، ایک بٹن دبا دیتی ہیں۔ جس کا نتیجہ کمرے میں انقلاب نورانی کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ کبھی سبز، کبھی فیروزی، کبھی سرخ، کبھی زرد، کبھی تیز سنہری، کبھی پھر سبز، کبھی سپید غرض یہ کہ کبھی کوئی رنگ ہوتا ہے کبھی کوئی۔ مختلف روشنیوں کے امتزاج سے جو کیفیات پیدا ہوتی ہیں وہ جداگانہ لطف رکھتی ہیں۔ روشنی کے اس تغیّر و تبدل اور امتزاج و آمیزش کی اس ترکیب و ترتیب کے علاوہ معنی خیز ہونے کے چشم و قلب و نیز ناظر و منظور پر جو عجیب و غریب اثر پڑتا ہے۔ اُس کی لذت کا اندازہ بادہ نوشانِ میکدۂ نیرنگی ہی خوب کر سکتے ہیں۔ یہ برقی روشنی جو چھت کے ان لیمپوں سے نمودار ہے شیشے کی ان چمک دار الٹی سیدھی کٹوریوں سے کوئی اصلی تعلق نہیں رکھتی۔ اس کا خزانہ اس کا منبع و مخزن کہیں اور ہے۔ وہاں سے چل کر ان آب گینوں میں سے چمک کر اہلِ دربار تک پہنچتی ہے۔ اور ان سے ہم آغوش ہو کر اپنا آنچل ان پر ڈال دیتی ہے۔ وہ منبعِ نور اپنا فیضان بند کر دے تو یہ برقی لیمپ کانچ کے بیکار ٹکڑوں سے زیادہ وقعت پیدا نہ کر سکیں۔

جو نقشہ چھت پر نظر آ رہا ہے وہی زمین پر دکھائی دیتا ہے۔ یہ حُسن کی جیتی جاگتی تصویریں مثل روشن سیاروں کے اپنی ذاتی روشنی سے نہیں چمکتیں۔ بلکہ یہ روشنی اُن میں کہیں سے آتی ہے۔ یہ شعاعیں اُن پر کہیں سے پھینکی جاتی ہیں۔

پر توِ حُسن تو در بحر بر انداختہ اند
آتش ایں است کہ درخشک و تر انداختہ اند

(تیرے حسن کا جلوہ بحر و بر میں ہے۔ یہ وہ آگ ہے جو خشک و تر ہر جگہ لگی ہوئی ہے۔)

یہ فیضان موقوف ہو جائے تو جملہ حسینانِ مجازی ایک خاک کا تودہ، ایک مٹی کا ڈھیر بن جائیں۔ یہ اُس معدنِ حُسن کی چمک ہے۔ جس نے اس دربار کو ایک جگمگاتا ہوا پرستان بنا رکھا ہے۔ اُس حُسنِ مطلق و جمالِ لامتناہی کے قربان، کیا کیا کثرت نمایاں ظہور میں آ رہی ہیں۔ کیسے کیسے سانچوں میں ڈھال ڈھال کر، کیسے کیسے پہلو بدل بدل کر، کیسی کیسی انوٹوں، کیسی کیسی کروٹوں، کیسی کیسی ترکیبوں، کیسی کیسی روپوشیوں کے ساتھ اپنا جمال با کمال کُھل کر اور چھپ کر، علانیہ اور مخفی، دیکھا جاتا ہے۔ اور دکھایا جاتا ہے۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہم چناں باقی

(نہ اس کے حسن کی کوئی انتہا ہے اور نہ سعدی کے کلام کا ہم پلّہ، پینے والا پیاسا مر جاتا ہے اور دریا اسی طرح باقی رہتا ہے۔)

آنکھیں اپنا کام کرتے کرتے تھک گئیں۔ دماغ آنکھوں کو تقویت پہنچاتے پہنچاتے عاجز آ گیا۔ شدتِ درد سے سر کے ٹکڑے ٹکڑے اڑے جاتے ہیں۔ مگر سیر ختم ہی نہیں ہوتی۔

منِ غریب بزلفِ تو مبتلا گشتم
بایں وسیلہ بیک عالم آشنا گشتم

(مَیں اجنبی تیری زلف کا اسیر ہو گیا اور اس کے ذریعے ایک عالَم سے آشنا ہو گیا۔)

سینے میں چشمے ابل رہے ہیں۔ سینے ہی کے اندر وہ وسعت اور پھیلاؤ اختیار کرتے جاتے ہیں اور سینے کے اندر ہی گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔

پرتوِ حسنت نہ گنجد در زمین و آسماں
در حریمِ سینہ حیرانم کہ چوں جا کردہ

(تیرے حسن کی جلوہ گری زمین و آسماں میں نہیں سما سکتی۔ مَیں اپنے دل میں حیران ہوں کہ تو نے کہاں جگہ بنائی۔)

دربار کی مزید تفصیلی کیفیت مجھ سے نہ پوچھو۔

باخبر بودن خوش است اندر مقامِ زاہداں

بے خبر در خانۂ خمار بودن ہم خوش ست

(زاہدوں کے ہاں باخبری اچھی ہے۔ جب کہ مدہوشوں کی بےخودی اچھی ہے۔)

کرسیوں کی تعداد و ترتیب، درباریوں کے اعداد و شمار، ان کا نذریں پیش کرنا۔ انھیں خلعت عطا ہونا، ان جملہ امور رسمی کی جانب میں نے مطلق التفات نہیں کیا۔ بلقیس کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے میں دربار ہال میں آیا تو تخت خالی تھا مگر بقیہ دربار آراستہ۔ شاہ جہاں، بدرِ منیر اور نور جہاں بھی دروازے سے ساتھ ہولیں۔ کمرے میں داخل ہوا تو نقیبوں کی صدائیں بلند ہوئیں۔ درباریوں نے سروقد تعظیم دی۔ گویا شاہانہ جاہ و جلال کا آغاز ہوا۔ مگر میں اپنے مقام پر پہنچتے ہی اپنے شغل میں ایسا منہمک ہوا کہ درباری روداد کا ہوش تک نہ رہا۔ مجھے ان غیر متعلق امور سے کیا دل بستگی ہوسکتی ہے۔ میں نے تو وہی دیکھا جس سے مجھے دل چسپی تھی۔ اور دل چسپی مجھے اُسی شے سے تھی جس کی مناسبت روزِ ازل سے مجھ میں رکھ دی گئی ہے۔ بس آنکھوں سے کام لیتا رہا۔ اور دل میں مستیوں کے تموج میں ڈوبتا اُچھلتا رہا۔

گہے بوسم بہ مستی پائے خم گہہ دستِ پیمانہ

کنم دریوزۂ فیض از بزرگ و خورد میخانہ

(کبھی مستی میں مئے خانہ کی قدم بوسی اور کبھی ساغر کی دست بوسی کرتا ہوں۔ مئے خانے کے چھوٹے بڑوں سے فیض کی بھیک مانگ رہا ہوں۔)

آنکھوں کو کان سے بھی کافی مدد ملی۔ موسیقیت کے چھینٹوں نے میکدے میں لطفِ جدید پیدا کردیا۔ مگر تفصیل اس کی بھی مجھ سے نہ پوچھو۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ اچھی اچھی صورتیں تھیں۔ پیارے پیارے گلے تھے۔ دلوں کو کھینچنے والی سریلی اور کھٹکے دار آوازیں تھی۔ دلکش اور مست کردینے والے ساز تھے۔ مضامین توحید سے لبریز غزلیں تھیں۔ ذوق و شوق میں ڈوبا ہوا نعتیہ کلام تھا۔ دل خوش کن دعائیہ اور تبریکی گیت تھے۔ چند پھڑکتی ہوئی ٹھمریاں، دادرے اور ٹپے تھے اور نہ

معلوم ایک چیز اور کیا تھی جسے میں مطلق نہ سمجھا۔ مگر لطف زیادہ اسی کا آیا۔ انتہائے مستی نے مجھے اس قابل نہ رکھا کہ جتنی چیزیں اُس بزمِ عیش میں مَیں نے سنیں انھیں یادرکھنا۔ صرف ایک چیز جس نے بہت بیتاب کیا اب بھی یاد ہے۔ وہ یہ غزل ہے!

بتم باہر سرے ہر سو سرد کارے دگر دارد
غمش باہر دلے سودا و بازارے دگردارد
جمال و عشق آں دلبرز ہر معشوق و ہر عاشق
بگا ہے جلوہ نظارے و دیدارے دگر دارد
اگرچہ دیدۂ گلزار روے او مشو قانع
کہ روئے اوجز ایں گلزار گلزارے دگر دارد
تو تنہا نیستی بیمارِ چشمِ شوخِ آں دلبر
کہ چشمش چوں تو در ہر گوشہ بیمارے دگر دارد
نہ تنہا مغربی باشد گرفتارے سرِ زلفش
کہ زلفِ اوبہر موئے گرفتارے درگردارد
دعائیں مانگتے مانگتے زبان خشک ہوگئی
دیکھے کہاں تھے ایسے حسینوں کے جمگھٹے
محشر کا روز اور الٰہی دراز ہو

(میرا محبوب ہر راز سے الگ تعلق رکھتا ہے۔ اس کا غم ہر دل کے ساتھ الگ سودا اور بازار رکھتا ہے۔ اس دل بر کا جمال و عشق ہر معشوق اور ہر عاشق کی نگاہ میں علاحدہ جلوہ گری کرتا ہے۔ اگر چہ گل زار کی آنکھیں اس کے چہرے سے نہیں ہٹتی کیوں کہ اُس کا چہرہ اس گل زار کے علاوہ اپنا علاحدہ گل زار رکھتا ہے۔ مت بول اس کے شہر اور بازار میں مَیں تنہا خریدار ہوں۔ وہ ہر شہر اور ہر بازار میں علاحدہ خریدار رکھتا ہے۔ تو اکیلا اُس دل بر کی شوخ آنکھوں کا مارا ہوا نہیں ہے۔ اس کی آنکھ ہر گوشے میں تیری طرح علاحدہ بیمار رکھتی ہے۔ اس کی زلفوں کا صرف مغربی ہی

اسیر نہیں ہے۔ اس کی زلفوں کے ہر بال کا علاحدہ اسیر ہے۔)

مگر تجربہ ہے کہ ایسی دعائیں کم قبول ہوتی ہیں۔ کمرے کی روشنی پہلے کی نسبت اب ذرا تیزی سے رنگ بدلنے لگی۔ دنیا کا کوئی رنگ باقی نہ رہا۔ جس نے اپنی چمک نہ دکھلائی ہو۔ بالآخر سبزی چھا گئی۔ اور کچھ عرصے تک قائم رہی۔ اس کے بعد وہ رنگ طاری ہوا، جواب تک طاری نہ ہوا تھا۔ وہ اصلی اور گہرا رنگ، جس پر کوئی دوسرا رنگ غالب نہیں آسکتا۔ کوئی ایسا بٹن دبایا گیا کہ روشنیاں سب غائب ہوگئیں۔ اور اندھیرا چھا گیا۔ اس نورِ لاہوتی کی متانت اور سنجیدگی کے سامنے ہر طرف سناٹا ہوگیا۔ مناظر پوشیدہ ہوگئے۔ اشیا غائب ہوگئیں۔ قرب و بُعد میں فرق نہ رہا۔ اور اپنا وجود تک اپنی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

گیان دھیان سب اٹھ گیو سبھا بھئی سب سُن
اونچ ۔ نیچ انتر نہیں ۔ نہیں پاپ نہیں ۔ پُن

ایک عرصے تک یہی حالت طاری رہی۔ اس کے بعد پھر نور چمکا۔ اور کمرے میں سفید روشنی پھیل گئی۔ لیکن اِدھر اُدھر نظر دوڑاتا ہوں تو کمرہ خالی، درباری غائب، چڑیں اُڑ گئیں۔ چھچے موقوف ہوگئے۔ دروازے سب بند کردیئے گئے۔ بس، تخت ہے، بندہ اور بلقیس۔

خلوتِ خاص است و جائے امن و نزہت گاہ اُنس
ایں کہ می بینم بہ بیدار یست یارب یا بخواب

(یہ خلوتِ خاص اور امن کی جگہ ہے۔ دکھ دور اور محبت ہے۔ یہ جو کچھ دیکھ رہا ہوں، خواب ہے یا حقیقت؟)

میری انوکھی۔ میری دنیا سے نرالی بلقیس! یہ کیا تماشا تھا۔ یہ تم نے کیسی کیسی شعبدہ بازیاں سیکھ رکھی ہیں۔ بھلا ان نظر فریبیوں کی ضرورت۔

برسوں آنکھوں میں رہے آنکھوں سے پھر کر دل میں آئے
راہ سیدھی تھی مگر پہنچے بڑے چکّر سے آپ

ان کثرت نمائیوں کے کھیل تماشوں سے دیکھو تاخیر ہوگئی، مجھ میں تم میں فصل واقع ہوگیا۔ تم

پہلو میں تھیں اور نظر سامنے کے گورے چٹے چہروں پر۔ کان خارجی نغمہ ہائے دل کش پر۔ وہ تو خیریت گزری کہ میں نے کسی چیز کو اپنے اصلی ٹھکانے سے کھسکنے نہ دیا۔ اصل کو اصل سمجھا اور فرع کو فرع، مُظہر ومظہر میں صحیح امتیاز قائم نہ رکھ سکتا تو پھسل ہی پڑتا اور ہمیشہ ہمیشہ کی ناکامی کو تقدیر میں لکھا پاتا۔ اس میں تمھاری ہی کوئی مصلحت ہوگی۔ کسی کی شان کا اظہار مقصود ہوگا۔ مگر اس تاخیر کا اب کیا علاج؟ ذرا گھڑی تو دیکھو۔ رات کا کس قدر بیش قیمت حصہ ان کھیل تماشوں کے نذر ہو گیا۔

شبِ وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو

کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شبِ جدائی کا، بعد انتظار شدید یہ وقت نصیب ہوا ہے۔ مدت دراز کے اشتیاق نے اس ساعتِ سعید کا دل فریب چہرہ دکھلایا ہے۔ اب ایسی تیز سی پلا دو کہ ہمیشہ متوالا بنا رہوں۔ اور گذشتہ تضیع اوقات کا صدمہ دل سے جاتا رہے۔

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم

ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مَے جس قدر ملے

مگر نہیں، وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں اب کہاں۔ مے کدہ پر تو اب سیاہ پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ انور لاہوتی نے اُن بدمستیوں اور اُس اُچھل کود کو معدوم ہی کر دیا۔ اب تو آؤ اس دوہے پر دل کھول کر گفتگو کریں۔

خسرو رین سہاگ کی سوئی پی کے سنگ

تن میرا من پیو کا۔ دونوں ایک ہی انگ

''دونوں ایک ہی انگ'' کی تو ذرا تشریح کرو۔

ہِیں! یہ کیا ماجرا ہے؟ نہیں کوئی غیر معمولی بات نہیں ایسا ہوتا ہے۔ اکثر ہوتا ہے۔

شبِ وصل اپنی آنکھوں سے یہ سب اندھیر دیکھے ہیں

نقاب اُن کا اُلٹنا، رات کا کافور ہو جانا

دمِ رخصت کسی نے یہ رباعی کان میں پڑھ کر پھونک دی اور اشتیاق کی ایک نئی آگ بھڑکا دی۔

گہ جلوہ گراز عارضِ گلگوں باشی
گہ خندہ زن ازلولوئے مکنوں باشی
در پردہ چنیں لطیف وموزوں باشی
آں لحظہ کے بے پردہ شوی چوں باشی

(کبھی سرخ رخسار سے جلوہ دکھاتا ہے۔ کبھی چھپے موتی کی طرح ہنستا ہے۔ جب پردے میں اتنا حسین ہے تو پردے سے باہر آئے گا تو کیسی جلوہ گری کرے گا۔)

☆☆☆☆☆

(۲۴)

پروانہ جل کے خاک ہوا شمع روچکی
تاثیرِ حُسن وعشق جو ہوتی تھی ہوچکی

مگر دل میں تپش اب بھی باقی ہے۔ ارمانوں کا ہجوم ہے۔ حسرتیں گھر کیے ہوئے ہیں۔ بے چینی چین نہیں لینے دیتی۔ اُلجھن اطمینان سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ طلب وتمنا سکون کی زندگی کو محال کیے ہوئے ہیں۔

سروسامان وجودم شررِ عشق بسوخت
زیرِ خاکسترِ دل سوزِ نہانم باقیست

(میرے وجود کے ایک ایک عضو کو عشق کی آگ نے جلا دیا ہے۔ اس جلے ہوئے دل کی راکھ میں تپش باقی رہ گئی ہے۔)

مٹا دیا۔ تباہ کردیا۔ اپنوں پرایوں سے بیگانہ بنادیا۔ عزّت وآبرو کو خاک میں ملا دیا۔ روٹی کا جو کچھ تھوڑا بہت سہارا تھا اُسے بھی ملیا میٹ کر دیا۔ مگر یہ اُلجھن، یہ تڑپن اب بھی نہیں جاتی۔ دل میں ٹھنڈک اب بھی نہیں پڑتی۔

ز نکہتِ سحری شوقِ یاری خیزد

جنون ز سایۂ ابرِ بہار می خیزد

(شوقِ محبوب سحر کی خوش بو سے پیدا ہوتا ہے اور بہار کے بادلوں کے سائے سے جنون میں اضافہ ہوتا ہے۔)

میں نے مانا کہ پستی سے مجھے نکالا گیا ہے۔ شکر گزار ہوں کہ بمبئی کے تنگ و تاریک مقامات اور وہاں کی کثیف و مبتذل آب و ہوا سے نکال کر مجھے بالائے کوہ پہنچا دیا گیا۔ مالا بار ہلس کی بلندیوں پر لطیف لطیف و پاکیزہ ہوا۔ اور فرحت بخش مصفّا اور مجلّا منزل میں میرا مسکن موجودہ قرار دیا گیا ہے مگر۔

آتشِ طور کجا، وعدہ دیدار کجاست؟

(آتشِ طور کہاں! اور دیدار کہاں؟) ....

حواسِ خمسہ کی کھڑکیوں سے روح کی کافی پرورش ہولی۔ آئینوں کی چمک دمک نے نگاہ کو کافی طور پر خیرہ کر دیا۔ دوئی کے پردوں نے آتشِ فراق کو کافی سے زیادہ بھڑکا دیا۔

روئے ہمہ خوبانِ جہاں بہر تماشہ

دیدیم و لے آئینۂ روئے تو دیدم

(تمام جہاں کے حسینوں کے چہرے جلوہ گری کے لیے ہیں۔ ہم دیکھتے تو ہیں لیکن تیرا چہرے کا آئینہ ہی دیکھتے ہیں۔)

خوبانِ جہاں ہی پر کیا موقوف، سارا جہان میری جس خدمت پر مامور تھا، اس سے وہ اب سبک دوش ہو گیا۔ وہ مجھ سے فراغت حاصل کر چکا اور میں اُس سے مستغنی ہو لیا۔

چوں جملہ جہاں مظہرِ آیات وجود اند

اندر طلب از مظہر و آیات گذشتیم

(جس طرح تمام جہاں اُس کی نشانیوں کا مظہر ہے۔ اس کے مظاہر اور نشانیاں اپنی طلب رکھے ہوئے ہے۔)

تجربے نے بتلا دیا کہ جمال میری منزل نہیں۔ کیوں کہ ایک حسین کی صحبت کچھ عرصے کے

بعد طبیعت کو اس کے حسن سے سیر کر دیتی ہے۔ جلال بھی میری منزل نہیں۔ کیوں کہ ایک عرصے کا تقرب وحشی درندوں سے بھی مانوس کر دیتا ہے اور خوف و وحشت کو دُور کر دیتا ہے۔ کمالات چوں کہ اُس ذاتِ لامحدود کے لامتناہی ہیں ان میں اُلجھاؤ ذرا دیر تک رہتا ہے۔ مگر منزل یہ بھی نہیں۔

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مقصود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

اس کے ماسوائے جتنی درمیانی چیزیں ہیں، سب حجابات ہیں، مسافر خانے ہیں۔ جاتی رہنے والی باتیں ہیں۔

مکن در جسم و جاں منزل کہ ایں دونست وآں والا
قدم زیں ہر دو بیروں نہِ، نہ ایں جا باش نہ آں جا

میرا دل اب کھلونوں سے نہیں بہلتا۔ یہ تماشے میری دل بستگی کا باعث نہیں ہوتے۔ تیرے کرم نے میرے دل میں وہ وسعت پیدا کر دی ہے کہ ان چیزوں سے وہ اب پُر نہیں ہوتا۔

بیروں ز حدودِ کائنات است دلم
برتر ز احاطۂ جہات است دلم
فارغ ز تقابلِ صفات است دلم
مرآتِ تجلّیاتِ ذات است دلم

(میرے دل کی وسعت کائنات سے سوا ہے۔ اس کی سمتیں احاطے میں نہیں آسکتی۔ اس کی صفات تقابل سے ماورا ہے۔ یہ ذات کی تجلیات کا آئینہ ہے۔)

اب اسے ایسی غذا دے جس سے اِس کا پیٹ بھرے ایسی یاقوتی کھلا کہ اس میں ذرا جان پڑے۔ ایسی مفرحات پلا کہ چین سے دو گھڑی آرام لے۔

راہ بکشا کہ دل میل بہ بالا دارد
پردہ برگیر کہ جاں عزمِ تماشا دارد

(تُو راہ کھول کہ میرا دل اوپر جانے کے لیے آمادہ ہے۔ پردہ اٹھا دے کہ جان دیدار کی طالب ہے۔)

مجھے میری اصلی منزل پر پہنچادے۔ ان آبی۔ بادی۔ خاکی اور آتشی حجابات کو اٹھا دے۔ پردہ ہائے ظلمت۔ پردہ ہائے انوار۔ اور پردہ ہائے کیفیات کو پاش پاش کردے۔ اور اپنی بے رنگی کی چادر میں مجھے لپیٹ لے۔ کیفیت بے کیفی کے جام پر جام مجھے پلائے جا کہ میں دیوانہ وار یہ کہتا ہوا تیرا طواف کیے جاؤں کہ۔ ؎

مستم امانہ از آں بادہ کہ سازند فرنگ
مستم امانہ از آں بادہ کہ سازند مغاں
للہ الحمد کہ در ساغرِ من ریختہ اند
مئے بے رنگ ز میخانۂ بے نام ونشاں

(مَیں مست ہوں مگر اُس شراب سے نہیں جو فرنگ اور مئے فروش بناتے ہیں۔ میرے ساغر میں وہ شراب ڈالی گئی ہے جو بے رنگ ہے اور بے نام ونشاں مئے خانے کی تیار کردہ ہے۔)

میرا قصور معاف کردے۔ یہ چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے۔ گستاخی ہے کہ میں ایسی چیز کا طالب بنوں، بے ادبی ہے کہ اپنی حیثیت سے اس قدر بڑھا ہوا سوال تجھ سے کروں۔ ؎

غرضِ ورائے امکاں چہ خیالِ فاسدست ایں
ہوسِ جمالِ سلطاں بدلِ گدا نشستہ

(یہ کیسا برا خیال ہے جو امکان سے باہر ہے کہ بادشاہ کے حسن کی ہَوَس فقیر کے دل میں ہے۔)

مگر مجبور ہوں، بے بس ہوں، لاچار ہوں۔ ؎

ادب از من چہ می جوئی چو می دانی کہ مدہوشم
طریق از من چہ می پُرسی جو می دانی کہ حیرانم

(مجھ سے ادب کا کیوں طلب گار ہے جب کہ تُو جانتا ہے کہ مَیں مدہوش ہوں۔ مجھ سے راہ کا کیا پوچھتا ہے جب کہ میں حیرت کی کیفیت میں ہوں۔)

تیری ہی کشش نے دل میں یہ شورش پیدا کی ہے۔ تیری ہی چشمِ عنایت اس دلیری کا باعث ہے اور تیری ہی نظرِ فیض اثر سے یہ بیل اب منڈھے چڑھے گی۔ ؎

گر نظر ازراہِ عنایت کنی

جملہ مہمات کفایت کنی

(اگر تو عنایت کی نظر کردے تو میری سب مشکلیں آساں ہو جائیں گی۔)

تیری نظر نے بڑے بڑے کام کیے ہیں۔ چھوٹوں کو بڑا بنا دیا، بڑوں کو نیست و نابود کر دیا، اوپر والوں کو نیچے گرا دیا، نیچے والوں کو اوپر چڑھا دیا، ناممکن کو ممکن کر دکھایا، ممکن کو موہوم کر دیا، میری کایا پلٹ دی، مجھ میں انقلاباتِ عظیم پیدا کر دیے، مجھ پر مزید عنایات و نوازشات کا مینہ برسا دے تو تیری رحمت سے کیا بعید ہے۔

بر عاشقاں روئے تو، بر ساکنان کوئے تو

از پر توے یک موئے تو کارِ معظّم تافتہ

(تیرے چہرے اور کوچے کے عاشقوں پر، تیرے ایک بال کے جلوے نے عظیم احسان کر دیا۔)

ہاں! اُٹھا دے۔۔۔ پردہ اٹھا دے۔۔۔ اپنے چہرے پر سے پردہ اٹھا دے۔

زروئے ذات برافگن نقابِ اسماء را

نہاں باسم مکن چہرۂ مسمّٰی را

(ذات کے چہرے سے اسما کے نقاب کو اُلٹ دے۔ تو اپنے چہرۂ مسمّٰی کو اسم سے مخفی نہ کر۔)

تاکہ یہ نظری دھوکے دُور ہو جائیں۔ شب تاریک کافور ہو۔ اور لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ کن غلطیوں میں مبتلا ہیں۔

فقیہاں دفترے رامی پرستند

حرم جویاں درے رامی پرستند

برافگن پردہ تا معلوم گردد

کہ یاراں دیگرے رامی پرستند

(فقیہ کتاب کو پوچھ رہے تھے۔ حرم کے متلاشی دروازہ دیکھ رہے تھے۔ تو پردہ اٹھا تاکہ پتا چلے کہ یار لوگ کسی اور کا معلوم کر رہے تھے۔)

تیری فیاضیوں میں کلام نہیں۔ تیری رحمت کے عام ہونے میں شبہہ نہیں۔ وہ زبان کٹ جائے جو تیری بارگاہ میں شکوہ وشکایت پیش کرے۔ وہ دل اُجڑ جائے جس میں تیری شکر گزاری کے جذبات موجزن نہ ہوں۔ مجھے اقرار ہے کہ جملہ کوتاہیاں میری ہی جانب سے ہیں۔ جملہ محرومیاں میرے ہی قصور کی بنا پر ہیں۔ ؎

ہر چہ ہست از قامتِ ناساز وبے اندام ماست
ورنہ تشریفِ تو بربالائے کس کوتاہ نیست

مگر میرا، سوائے تیرے کون ہے جس کے آگے ہاتھ پھیلاؤں، میں تیری ہی قوت سے جیتا ہوں۔ اور تیری ہی قوت سے مرتا ہوں۔ تیری ہی قوت سے مہلکات سے محفوظ رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور تیری ہی قوت نے تیری نظروں میں مقبول بننے کے لیے ہاتھ پیر مارتا ہوں۔ تو ہی مجھے ہلاکت سے بچاتا ہے۔ اور تو ہی مجھے بقا کی جانب لے جاتا ہے۔ اس لیے میں تجھی سے سوال کرتا ہوں کہ میرے قصوروں کو معاف کردے۔ میری کوتاہیوں کو دُور کردے۔ اور اپنی قدرت عالیہ اور رحمتِ کاملہ سے میرے قامتِ ناراز کو بدل کر اُسے اپنے کسی پسندیدہ سانچے میں ڈھال دے۔ ؎

حافظ وصال می طلبد از رہے دعا
یارب دعائے خستہ دلاں مستجاب کن

(حافظ دعا کے ذریعے وصال طلب کررہا ہے۔ اے مالک خستہ دلوں کی دعا قبول فرمائے۔)

میرے کانوں میں یہ آواز آرہی ہے کہ۔ ؎

حجابِ چہرۂ جاں میشود غبارِ تنت
تو خود حجابِ خودی حافظ از میاں برخیز

(تیرے جسم کا غبار چہرے کا حجاب بن جاتا ہے۔ اے حافظ! تو درمیان سے نکل کیوں کہ تو خود ہی اپنے لیے حجاب ہے۔)

مگر اس میں بھی تو تیری ہی مدد کا محتاج ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میری پستی کا باعث یہی حجابِ خودی ہے۔ نقاب آب وخاک اس حجاب کی محافظت کرتا ہے۔ ؎

روحِ قدسی سجدہ آرد پیش آں حُسن و جمال
گر نقابِ آب و خاک از روئے آدم درکشم

(اگر مَیں آدم کے چہرے سے پانی اور مٹی کا نقاب ہٹادوں تو روحِ قدسی اس حسن و جمال کو سجدے کرے۔)

ان زنجیروں نے میرے پیر جکڑ دیے۔ اُڑنے نہیں دیتیں، وطن تک میری رسائی کو محال کیے ہوئے ہیں۔ مگر تا بہ کیے۔ جب تیرا اشارہ ہو گیا ہے۔ جب تو نے اپنے دامنِ نگاہ میں مجھے جگہ دیدی ہے۔ جب تو نے اپنے دفتر میں میرا نام درج کرلیا ہے۔ تو یہ فانی زنجیریں مجھے مقصودِ اصلی تک پہنچنے میں کب تک مانع آئیں گی۔

تا بکئے محنتِ مہجوری و دوری بکشم
نازنینِ وطنم سوئے وطن باز روم
تا کئے با فسو خاشاک بود صحبت من
صدر بزمِ چمنم سوئے چمن باز روم
تا بکئے ہمدمِ سنگ شود شیوۂ من
گوہرے از عدنم سوئے عدن باز روم

(مَیں ہجر اور دوری کی تکلیف کب تک اٹھاؤں گا۔ اے میرے نازنینِ وطن! اپنے ملک کی طرف لوٹ جاؤں۔ خس و خاشاک سے کب تک گزارا کروں گا۔ میری بزمِ چمن کے صدر! چمن کی طرف لوٹ جاؤں۔)

تیرا اشارہ ہو جائے اور تیری مدد شامل ہو تو چشم زدن میں یہ حجاب بھی اٹھا جاتا ہے۔

وقت آں آمد کہ دل از ہر دو عالم برکنم
ایں جہان و آں جہاں را درہم و برہم کنم

(وہ وقت آگیا ہے کہ دلوں کو دونوں جہانوں سے علاحدہ کرلوں اور اس جہاں اور اُس جہاں کو ختم کردوں۔)

ملک و ملت کی زنجیریں، قوانین مختلفہ کی زنجیریں، رسم و رواج کی زنجیریں، عادات و خصائل کی زنجیریں، طبیعت کی زنجیریں، نفس کی زنجیریں، عقل کی زنجیریں، وہم و گمان کی زنجیریں، تخیلات کی زنجیریں، ایسی نہیں کہ انسان ضعیف البنیان انھیں آسانی سے توڑ سکے۔ لیکن تیری عنایت ہو گئی تو ان

تمام زنجیروں کو ایک جھٹکے میں توڑ کر ابھی وہاں پہنچتا ہوں جہاں کسی فرشتے کا بھی گزر نہ ہو۔

فرشتہ گرچہ دارو قُرب درگاہ
نہ گنجد در مقامِ لی مع اللہ

(فرشتہ اگر چہ اللہ کا ورب رکھتا ہے مگر میرا اللہ کے ساتھ جو تعلق ہے۔ اُس تک نہیں پہنچ سکتا۔)

یا اللہ! مجھے توفیق عطا فرما کہ اب زبانی جمع خرچ سے باز رہوں۔ قصہ خوانی موقوف کروں۔ اغیار سے منہ پھیرلوں۔ اضافات وموانعات ومہلکات ومکروہات ومشتبہات سے گریز کروں اور تیرے، صرف تیرے، میدانِ رضا میں اٹھکھیلیاں کرتا پھروں اور تیرے مے کدۂ خلوت میں سرشار ومستغرق رہوں۔

چومستِ خلوتش گشتی فلک راخیمہ برہم زن
ستون عرش درجنباں طنابِ آسماں درکش
طریقش بے قدمی رو۔ حدیثش بے زباں میگو
جمالش بے بصری میں۔ شرابش بے دہاں درکش

(اس سے جب تنہائی میں مدہوش ہوا ہے تو آسمان کے خیموں کو اکھاڑ دے۔ عرش کے ستونوں کو ہلا کر رکھ دے اور اس کی طنابوں کو کھینچ دے۔ اس کی بات بنا زبان کر اور اس کی راہ میں بغیر پاؤں کے سفر کر۔ اس کا حسن بن آنکھوں کے کر اور اس کی شراب بغیر منہ کے پی۔)

ایک نکتہ تھا۔ پھیلا۔ سمٹا۔ سمٹ کر پھر نکتہ بن گیا۔ پھیلا۔ سمٹا۔ مگر نہ پھیلنے میں مستغیر ہوا۔ نہ سمٹنے میں متبدل۔ جیسا تھا ویسا ہی رہا۔ اور ویسا ہی رہے گا۔ اس نکتے سے باہر نہ ہو۔ اسی میں رہو۔ اور اُس میں کسی چیز کو شامل نہ کرو۔

اَلْعِلْمُ نُقْطَةٌ كَثَّرُهَا الْجِهَلُ۔

صورت از بے صورتی آمد برون
باز شد اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

☆☆☆☆☆

دیباچہ

کس زبانِ مرانمی فہمد
بعزیزاں چہ التماس کنم

(کوئی میری زبان ہی نہیں سمجھتا تو پھر دوستوں سے کیا کہوں؟)

کرۂ خاکی کے ایک سیاح آوارہ گرد جہاں گشت کی نَے سے نکلی ہوئی صدائے ہستی کی یہ نغمہ سرائیاں ان اوراقِ پریشاں میں ناظرین کی پراگندیٔ طبع کا باعث ہونے کے لیے حیاتِ مستعار کا پیراہن کاغذی اختیار کرتی ہیں۔

جن حضرات کو جان و دل عزیز ہو۔ جنہیں اس دنیا میں رہ کر آسمانِ شہرت پر آفتاب بن کر چمکنے کی تمنا ہو۔ وہ ان اوراق کے مطالعے سے گریز کریں اور اپنی جان پر ترس کھا کر اس آتش کدۂ الفت سے دُور بھاگیں۔

جو میدانِ جان بازی کے پہلوان اور دریائے جان فروشی کے شناور ہیں۔ وہ شوق سے اس کی ورق گردانی کریں۔ مگر ذرا سمجھ کر پڑھیں غور سے مطالعہ فرمائیں۔ ظاہری دلفریبی کی باطنی رعنائی کے لیے حجاب نہ ہونے دیں۔ ہر چیز کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ اس کتاب کا بھی ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ کہیں اور ظاہرہ باطن میں اختلاف ہوتو ہو۔ مگر یہاں ظاہر و باطن ایک ہے۔ اسی وجہ سے ظاہر و باطن میں امتیاز ذرا دشوار ہو گیا ہے۔ تاہم ناظرین جب تک ظہور و بطون میں صحیح امتیاز نہ کر سکیں گے لذتِ زیست کی اُن دل چسپیوں سے جن کا یہاں خاکہ کھینچا گیا ہے۔ پورے طور پر لطف اندوز نہ ہو سکیں گے۔

بیا اے دل دمے از ہستیٔ خود ترکِ دعویٰ کن
می فگن چشم برصورت نظر در عینِ معنےٰ کن

(اے دل! آ اور ایک ساعت کے لیے اپنی ہستی کا دعوا ترک کر دے۔ ظاہر کو مت دیکھ، حقیقت کے اندر اُتر۔)

لوگ کہتے ہیں یہ ناول ہے۔ میں کہتا ہوں یہ سوانح عمری ہے۔ لوگ کہتے ہیں فسانہ ہے۔ میں کہتا ہوں حقیقت کا ترانہ ہے۔ لوگ کہتے ہیں اسے پڑھ کر جی بہلتا ہے۔ وقت کٹتا ہے۔ میں کہتا ہوں اسے پڑھ کر رونا آتا ہے۔ بربادیٔ وقت پر حسرت ہوتی ہے۔ لوگ اس قسم کی کتابوں میں کذب پر صدق کا جامہ پہناتے ہیں۔ میں نے اس کتاب میں صدق پر کذب کا تو نہیں مگر ہاں کذب نما صدق کا جامہ ضرور چڑھایا ہے۔ لوگ کتاب لکھ کر خوش ہوتے ہیں کہ خوب لکھا۔ میں اسے لکھ کر نادم ہوں کہ کچھ نہ لکھا گیا۔

معانی ہرگز اندر حرف ناید
کہ بحر قلزم اندر ظرف ناید

(بہت سے معنی ایک حرف میں نہیں آسکتے۔ جس طرح سمندر برتن میں سما نہیں سکتا۔)

جہاں اس کتاب میں چند اور خصوصیات ہیں۔ ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ دیباچہ بجائے اول کے آخر میں درج ہے۔ اس میں بھی چند مصلحتیں ہیں جن کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں۔ یہ اوراق کم از کم دو مرتبہ کے مطالعہ کے مطالبہ کرتے ہیں۔ جب آپ دوسری مرتبہ ان کا مطالعہ فرمائیں گے تو آخر کا دیباچہ اول آجائے گا۔ گویا ایک مرتبہ اس کتاب کا سرسری مطالعہ اور یہ دیباچہ مل کر تمہید ہوں گے۔ مطالعہ ثانی یعنی مطالعہ اصلی کی۔ جب تک اس ترتیب سے مطالعہ نہ ہوگا بعض امور نظر سے اوجھل رہیں گے۔

بہر حال اس کتاب کے مطالعہ کا آپ کو شوق ہے تو ذرا گہری نظر سے اس کا مطالعہ فرمایئے۔ کیوں کہ آپ ہی کی نظر اور آپ ہی کی ذاتی دل چسپی اس میں لطف پیدا کرے گی۔ ورنہ کتاب میں تو کچھ بھی نہیں۔ چند الفاظ غیر ذی روح کا مجموعہ ہے۔ اور بس۔ ؎

تیرے الفاظ نے کر رکھے ہیں پیدا دفتر
ورنہ کچھ بھی نہیں اللہ کی قدرت کے سوا

خیر۔ میری اس کتاب کا تو آپ مطالعہ فرما چکے ہیں اب ذرا میرا بھی مطالعہ فرما لیجیے۔

میں یہاں ایک پردیسی ہوں مسافر اور غریب الوطن۔ بڑی دُور کا رہنے والا ہوں۔ مسافت بعید بے کر کے یہاں آیا ہوں۔ آیا کیا ہوں۔ گرفتار کر کے بھیج دیا گیا ہوں۔ جس طرح کسی خونی مجرم کو گرفتار کرتے ہیں۔ پھر اس پر ترس کھاتے ہیں اور بجائے پھانسی دینے کے عبور دریائے شور کا حکم سُنانے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اسی طرح میں بھی اسیر بنا کر اس مقام بعید میں بھیج دیا گیا ہوں۔ یہ ملک میرے لیے کالے پانی کا حکم رکھتا ہے۔

میں عالمِ ملکوت کی ایک چڑھا بلکہ باغِ قدس کا ایک مرغ ہوں۔

مرغ باغِ قدسیم باقدسیاں بودم بسے
چند گاہے شد کہ ہست ایں فرشِ خاکی مسکنم

(مَیں باغ قدس کا طائر ہوں۔ قدسیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ کچھ ہی وقت قبل یہ فرشِ خاکی میرا مسکن بنا ہے۔)

زمانوں کے آغاز سے پہلے ایک زمانہ تھا۔ ان وقتوں سے قبل ایک وقت تھا۔ جس پر نہ وقت کا اطلاق ہوتا تھا نہ زمانہ کا۔ جب میں ایوانِ شاہی کا جزو کُل تھا۔ مکانِ لامکاں کا مکینِ بے مکاں اور دیارِ محبوب میں نشانِ بے نشاں تھا۔ پہلوئے یار میں ایک اندرونی چٹکی، مخفی گدگدی، پوشیدہ سوز و گداز، اور چھپا ہوا خزانہ تھا، محرمِ اسرار تھا، پستی و بلندی سے بالاتر، ظہور و اظہار سے بری، وصل و فصل کے جھگڑوں سے پاک، انتہائے بلندی سے بھی بالاتر مقامات پر بے پر و بال اُڑتا پھرتا تھا۔ بڑی قدرت والا، بڑے حوصلہ والا، بڑے ظرف والا، بڑی رسائی والا، جہات و تعینات و حدود سے آزاد، عروج و نزول و سکون و حرکت سے بری تغیرات سے مستثنیٰ، بے خبری و باخبری تک کی رسائی سے محفوظ، جانے کیا تھا، اور کیا نہ تھا، کچھ نہ تھا، اور سب کچھ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ سب کچھ اور کچھ نہ ہونے سے بھی ماورئی تھا۔

پیش از ظہور ایں قفسِ تنگ کائنات
ماعندلیبِ گلشنِ اسرار بودہ ایم

بے ما و بے شما و کجا و کدام و کے

بے چند و چون و اندک و بسیار بودہ ایم

(اس کائنات کے تنگ قفس سے پہلے ہم گلشنِ اَسرار کے بلبل ہُوا کرتے تھے۔ ہم، تم، کہاں، کون سے، کتنے، کیسے، تھوڑے اور بہت کے چکر کے بغیر۔)

تمام جہان کی قوتیں میرے آگے سرنگوں تھیں۔ مشارق و مغارب میری چٹکی میں تھے۔ شمال و جنوب میری ایڑی کے نیچے دبے ہوئے تھے۔ فرشتے تک میرے سامنے پستی کا اعتراف کرتے تھے۔

فرشتہ گرچہ دارد قربِ درگاہ

نہ گنجد در مقامِ لی معَ اللہ

(فرشتہ اگرچہ اللہ کا ورب رکھتا ہے مگر میرا اللہ کے ساتھ جو تعلق ہے۔ اُس تک نہیں پہنچ سکتا۔)

مگر میری ساری قوتیں مجھ سے سلب کرلی گئیں۔ قوتِ پرواز مجھ سے چھین لی گئی اور ایک تنگ و تاریک پنجرے میں مقید کر کے مجھے اس عالمِ کثیف وغلیظ میں بھیج دیا گیا۔

جاں زشوقِ عارض و خالش فرودآمد بہ تن

مرغ رامائل بہ پستی ذوقِ آب و دانہ کرد

(اُس کے رخسار اور تل کے شوق میں بدن میں جان آئی ہے۔ پرندے کو آب و دانے کی خواہش نے پستی کی طرف مائل کیا۔)

قضائے قدس لے ہم نشینوں سے جدا ہو کر میں اس کائناتِ تنگ و تاریک میں آیا۔ جہاں میرا کوئی یار تھا نہ غمخوار، عزیز نہ رشتہ دار، گھر نہ در، تو یہ بے کسی اور اپنوں سے مفارقت اور گرد و پیش کی ظلمت و کثافت دیکھ کر مجھ پر غائیت درجے کا حزن طاری ہوا۔ میں چیخیں مار مار کر اور بلک بلک کر رونے لگا۔ میں روتا تھا اور میرے قید خانے کے داروغہ جو مجھ پر مسلط تھے ہنستے تھے اور شادمانی کے نعرے بلند کرتے تھے۔ نہ میری اس مصیبت سے کسی کو ہمدردی تھی۔ نہ میرے رنج و غم کی کیفیت سے کوئی متاثر تھا۔ اپنے گرد و پیش جسے دیکھا کوتا بینی اور خود غرضی میں منہمک پایا۔ ان احمقوں کی بلاوجہ مسرت سے طبیعت اور بھی زیادہ جھنجھلاتی تھی اور میرے مزاج کا تھرمامیٹر بات

بات پر اعتدال سے ہٹ جاتا تھا۔ قیدی تو تھا ہی۔ اسلوب برتاؤ بھی میرے ساتھ پورا قیدیوں کا سا کیا گیا۔ کبھی تنہا نہیں چھوڑا گیا۔ نگراں ہر وقت مسلط رہے۔ نپا تُلا کھانا ملتا رہا۔ نقل وحرکت کی اجازت ہوئی بھی تو ہزاروں قیود و پابندیوں کے ساتھ۔ خیالات و معلومات تک کو مقید کر دیا گیا۔ ہر طرف سے بندشیں۔ رُکاوٹیں۔ مشکلات اور مخالفتیں، سدِ سکندر بھی رہیں۔ پستی، ظلمت اور جہل نے نگاہ کو بھی محدود رکھا۔ کوئی بات بھی تو ایسی نہ تھی جو جی لگتا یا طبیعت بہلتی۔

باوجود ایسی مضر آب و ہوا کے، اور باوجود اُن تباہ کن اثرات کے جو چاروں طرف سے مجھ پر ڈالے جاتے تھے۔ میں ایک مدت تک تمام نجاستوں اور خرابیوں سے اپنی ذات سے پاک رہا حتی کہ یہاں والے بھی مجھے معصوم قرار دیتے رہے۔ اور بوجہ اُس طہارت ازلی کے جو میں اپنے ہم راہ لایا۔ اور بوجہ اُس بے تعلقی کے جو ماسوا کے ساتھ ایک عرصے تک مجھے رہی۔ ہر شخص کے دل میں مجھے دیکھ کر پیار آتا رہا، میری حرکتوں میں دل کشی رہی۔ اور میری باتیں سب کو بھولی میٹھی اور دل خوش کن معلوم ہوتی رہیں مگر فطرت کے آہنی شکنجے سے میں نہ نکل سکا۔ اور قوانینِ قدرت کی حکومت سے آزاد ہونے کی قوت میں نے اپنے میں نہ پائی۔

اس ظلمت کدہ کی تاریکیوں نے آخر اپنا رنگ دکھایا۔ ہم نشینی اور صحبت کے اثر کی میں تاب نہ لا سکا اور عالم کثیف کے رہنے والوں نے مجھے بھی رفتہ رفتہ اپنا ہی سا کر لیا۔ جب میں یہاں والوں کے رنگ میں رنگ گیا تو اپنی اصلیت کو بالکل بھول گیا۔ وطن کا خیال دل سے جاتا رہا۔ یادِ چمن نے بے چین کرنا چھوڑ دیا۔ سیرِ چمن کا ولولہ باقی نہ رہا اور دال چپاتی کے جھگڑوں اور بیوی بچوں کے چکّر میں سرگرداں رہنے لگا۔ شاہی فرمان کی تعمیل میں یہاں آیا تھا۔ مگر شاہی منشا کے خلاف اس سرائے فانی کو اپنا وطن قرار دے لینے کی غلطی کا جو خمیازہ تھا، مجھے بھگتنا پڑا۔ رحم دل بادشاہ کسی کو قید کی سزا دیتا ہے۔ تو انتقام لینے کی غرض سے نہیں دیتا۔ بلکہ اُسے قیدی کی اصلاح مقصود ہوتی ہے۔ اسی مصلحت کو مدّ نظر رکھ کر قیدی کو قید خانے میں وہ راحت اور وہ لذیذ غذائیں نہیں دی جاتیں جن کو وہ اپنی اصلی زندگی میں عادی ہوتا ہے۔ بلکہ تکلیف پہنچائی جاتی ہیں۔ اور بدمزہ غذاؤں پر اُسے رکھا جاتا ہے تا کہ قید خانے سے اُسے بجائے دل بستگی پیدا ہونے کے نفرت ہو۔ اور وہ اپنی اصلاح کے

در پے ہو کر سرخ روئی کے ساتھ وہاں سے نکلنے کا آرزومند رہے۔

میرے رحیم و کریم شہنشاہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ جن لذیذ غذاؤں کا میں اپنی لطیف زندگی میں عادی تھا۔ اُن سے مجھے محروم رکھا۔ مصائب و پریشانیوں کے چابک اور دُرّے میری پشت پر وقتاً فوقتاً برستے رہے۔ مگر کثافت پسند اور غلاظتِ مجسم ہم نشینوں کی صحبت نے مجھے ایسا مسخ کیا کہ یہ تکالیف مجھے تکالیف ہی نہ معلوم ہوئیں۔ غضب خدا کا کہ جس پنجرے میں مجھے مقید کیا گیا تھا۔ اُسی پنجرے پر میں عاشق ہو گیا اور۔

رفتہ رفتہ میری صورت یار کی صورت ہوئی

مجھ میں بھی بتدریج اُسی آہنی پنجرے کی سلاخوں کی سی سختی اور بے حسی پیدا ہو گئی۔

اس تفس کی تاریکی میں میری رہنمائی کے لیے پے در پے بجلیاں چمکائی گئیں۔ مشعلیں دکھلائی گئیں۔ روشنیاں پھینکی گئیں۔ مگر میری بے حسی نے کوئی اثر قبول نہ کیا۔ بالآخر ایک ایسی کڑاکے دار اور چندھیا دینے والی بجلی چمکی جس نے مجھ میں لرزہ پیدا کر دیا۔ انقلابِ عظیم برپا کر دیا۔ اور میرے ہوش و حواس گم کر دیے وہ ہوش و حواس جو اس فریب دہ اور مغالطے میں ڈالنے والے قید خانے کے ساختہ پرداختہ تھے انھیں تو اس برق کیمیا اثر نے یقیناً خاک سیاہ کر دیا۔ لیکن میرے صحیح اور اصلی ہوش و حواس جو اس درمیان میں کند اور زنگ آلود ہو گئے تھے تیز ہو گئے۔ اور میری حقیقت بینی اور آقا شناسی جو روزِ الست سے میرے حصے میں آئی تھی، چمک اٹھی۔ اُس روشنی کے دل میں آتے ہی مجھے پھر اپنا وطن یاد آ گیا۔ اور یہ جیل خانہ تنگ و تاریک نظر آنے لگا اپنے گم کردہ جواہرات اور اپنی ضائع شدہ خوبیوں کی تلاش پر کمر بستہ ہو گیا۔ اور اپنی فلاح کے لیے جابجا دروازے کھٹکھٹانے لگا۔

یک عمر قدم براہِ افسانہ دیم
یک چند درِ کعبہ و بت خانہ زدیم
المنۃ للہ کہ آخر اے درد
در مے کدہ آمدیم و پیمانہ زدیم

(ایک عمر تک سراب میں چلتے رہے۔ کچھ وقت کعبے اور بُت خانے میں گزرا۔ اے دردؔ! اللہ کی مہربانی ہے کہ آخر کار مئے خانے میں آئے اور جام پکڑ لیا۔)

اب اپنے محبوب حقیقی کی الفت میں سرشار ہو کر مے کدۂ وحدت کے جام پر جام پیتا ہوں۔ اور قیدِ عنصری سے آزاد ہو کر فضائے قدس کی انھیں بلندیوں پر پھر اُڑ جانے کا نہایت بے چینی سے منتظر ہوں۔

جس روشنی نے مجھے اس عارضی تاریکی سے نکال کر اپنی اصل کی جانب رجوع کرنے کی توفیق دی اس کی چمک دار شعاعوں میں سے بعض کا دُھندلا سا خاکہ آپ ان اوراق میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چو غلامِ آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

(مَیں رات ہوں نہ رات کا دیوانہ جو خواب کی بات کروں مَیں جب سورج کا غلام ہوں تو سورج ہی کی بات کروں گا۔)

میرے اس دورِ تنزل میں یوں تو بہت سی تجلیاں چمکیں مگر مجھ پر اُسی بجلی نے اثر ڈالا جو میرے ہی لیے مخصوص تھی۔ بجلیاں نہایت اوپر کی چیز، اوپر ہی سے چمکنے والی، اور چمک کر اوپر ہی رہ جانے والی، اور میں اس قدر عمیق پستی میں کہ بلندی سے بظاہر کوئی مناسب ہی نہیں۔ بھلا اثر ہو تو کیوں کر۔ ضرورت تھی کہ ایک ایسی چیز ہوتی جو اُدھر بھی ہوتی اور ادھر بھی۔ بلندی کی چیز ہوتی بلندی سے آتی۔ پستی میں میرے ساتھ کچھ دن رہتی۔ مجھ سے اُنس پیدا کرتی۔ مجھے اپنا گرویدہ بناتی۔ اور اپنی گود میں مجھے لے کر پھر اُنہیں بلندیوں پر اُڑ جاتی۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ زیادہ وضاحت کے لیے کسی تشبیہ یا تمثیل کی ضرورت ہو تو شاہجہاں ہی کے قصہ کو لے لیجیے۔ صنفِ لطیف کی ایک اعلیٰ درجہ کی نستعلیق شائستہ آراستہ پیراستہ موہنی۔ نہایت بلند مرتبہ اور اونچے اونچے محلات کی رہنے والی ہما۔ موٹر اور ہوائی جہازوں میں اُڑنے والی چڑیا، نت نئے روپ میں جلوے دکھلانے والی کامنی۔ اس متبذل اور کثیف الخصلت حیوانِ ناطق کی خاطر۔ ع

''بہر دلِ بُردنِ من صورتِ انساں داری''

(ہمارا دل کو توڑنے کے لیے انسان کی صورت رکھی۔)

پرعمل کر کے سندر کے روپ میں آتی ہے اور مجھے اپنے موٹر پر سوار کر کے آسمانوں کی جانب لے اُڑتی ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفت آید در حدیثِ دیگراں

(بہ تر یہ ہے کہ دوستوں کے راز دوسروں کی باتوں میں کیے جائیں۔)

شاہجہاں اپنے اصلی روپ اور حقیقی جاہ و جلال میں بینڈ اسٹینڈ پر ملتیں تو رُعب حسن مجھے جرأت نہ دیتا کہ میں کنکھیوں تک سے اُن کی جانب نظر کرتا۔ اختلاف جنسیت کے لوازمات موقعہ ہی نہ دیتے کہ میں یوں کُھلے خزانے اُن سے پان لے کر کھاتا اور دوسرا پان طلب کرتا اور گفت وشنید کا سلسلہ شروع ہوتا بلکہ میری شرافت مجھے مجبور کرتی کہ میں چپکے سے وہاں سے کھسک جاتا اور اُس بینچ سے اٹھ کر کہیں اور چل دیتا۔

اُس میں اور مجھ میں ہے ربط اے ذوق مثلِ بو وگُل
وہ رہا آغوش میں لیکن گریزاں ہی رہا

اختلافِ جنسیت کی بیگانہ رکھنے والی اجنبیت پر میری ناسوتی کمزوریاں ہرگز غالب نہ آسکتیں اور یہ مقناطیسی گرو یا ہم جنسی کے بکس میں بند ہو کر میرے پاس نہ آتی تو میں بہارستانِ ہستی کی اُس سیر سے لطف اندوز نہ ہونے پاتا جس نے ان صفحات کو رنگین کر رکھا ہے۔

خیر۔ یہ تو ایک مثال تھی جو اس برقی کشش کی نوعیت سمجھانے کی غرض سے پیش کی گئی ہے جس نے مجھ پر کامیابی حاصل کی۔ آپ سے یہ درخواست ہے کہ آپ مہربانی فرما کر اس نگاہ سے شاہجہاں، نور جہاں، بدر منیر اور بلقیس کا تعاقب نہ فرمائیں اور ان نیک بخت خاتونوں کے چہروں پر سے نقاب کھوٹنے کی کوشش نہ کریں۔ بلکہ اُنھیں اپنے اصلی ٹھکانہ ہی پر رہنے دیں اور میری سرگذشت سے کوئی سبق لینا یا نتیجہ نکالنا چاہتے ہوں تو میری اس آخری نصیحت پر اللہ کا نام لے کر

عمل شروع کردیں کہ اپنے نکتۂ نظر کی اصلاح فرما کر صراطِ مستقیم پر ہولیں اور نہایت مستعدی کے ساتھ اپنے کام میں منہمک رہیں۔

اسرارِ طریقت ایں چنین ست
رہ رو طریقِ ماہمین ست
بگذر نہ منازل و مقامات
کان نقشِ خیال خردبین ست

(طریقت کے راز اسی طرح ہیں۔اس راہ پر چل کہ ہمارا یہی طریقہ ہے۔منازل اور مقامات سے گزر جا کیوں وہ نقشِ خیال ہے۔)

✧ ✧ ✧

تعارف پیش کار

ڈاکٹر ذوالفقارعلی دانش ۲۴، اکتوبر ۱۹۶۶ء کو سندھ کے چوتھے بڑے شہر میرپورخاص میں پیدا ہوئے۔ تعلیمی اسناد میں تاریخ پیدائش ۱۴، مارچ ۱۹۶۷ء درج ہے۔ یہ شہر این۔جی اوز اور مینگوز (آم) کی وجہ سے دنیا میں شہرت کا حامل ہے۔ ابتدائی تعلیم اسی شہر کے گورنمنٹ لیاقت پرائمری اسکول ڈھولن آباد میں حاصل کی۔ میٹرک گورنمنٹ ماڈل ہائی اسکول، انٹر، بی۔اے گورنمنٹ ماڈل کالج میرپورخاص اور ایم۔اے اردو سندھ یونی ورسٹی جام شورو کے اولڈ کیمپس حیدرآباد سے کیا۔ ۲۰۱۳ء میں سندھ یونی ورسٹی جام شورو ہی سے ''سندھ کی خانقاہوں میں اردو کی نثری اصناف کا ارتقا'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ پیش کر کے پی ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی۔

سرکاری ملازمت کا آغاز ۷، جون ۱۹۸۷ء کو بحیثیت معلم پرائمری سکول کیا۔ بعدازاں ۱۰، اپریل ۱۹۹۳ء میں سندھ پبلک سروس کمیشن کی سفارش پر اردو کے لیکچرار ہوئے۔ ۱۹۹۲ء میں شاعری اور افسانہ نگاری کا آغاز کیا مگر مستقل مزاجی سے دونوں کام نہیں کر سکے۔ کبھی کبھار غزل کہہ لیتے ہیں۔

۲۰۰۰ء میں تاج قائم خانی کی سرپرستی؛ کرن سنگھ اور نوید سروش کے ساتھ مل کر کتابی سلسلہ پہچان میرپورخاص کا اجرا کیا۔ جس کے اب تک ۲۵ شمارے منصۂ شہود پر آ چکے ہیں۔ آخری دو شمارے ''تاج قائم خانی نمبر'' اور دنیائے تصوف کا پہلا اردو ناول ''بادہ وساغر'' از سید شاہ محمد ذوقیؒ ان کی زیرِ نگرانی ترتیب دیے گئے۔

ڈاکٹر ذوالفقارعلی دانش کی شاعری، کتابوں پر تبصرے، تجزیے، تنقیدی اور تحقیقی مضامین اردو کے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں کچھ نام یہ ہیں۔ تحقیق، الماس (ایچ ای سے منظور شدہ)، ادبیات، ماہِ نو، لوحِ ادب، انشا، آفاق، پہچان، المنظہر، ادب انٹرنیشنل، زیست، اکرام المشائخ، لطیف میگزین، قائد وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ آج کل بحیثیت اردو اسسٹنٹ پروفیسر پریمیئر گورنمنٹ کالج (صبح) نارتھ ناظم آباد میں تدریسی خدمات انجام دے رہیں ہیں۔

☆☆☆☆☆

پہچان کے ۲۵ شماروں کے اہم نکات

شمارہ نمبر	سنہ اشاعت	تخصیص
۱	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۰ء	گوشۂ تاج قائم خانی
۲	جنوری تا مارچ ۲۰۰۱ء	گوشۂ احمد نصیر
۳	اپریل تا جون ۲۰۰۱ء	گوشۂ قاسم رحمان
۴۔۵	جولائی تا دسمبر ۲۰۰۱ء	گوشۂ فاطمہ حسن
۶	جنوری تا مارچ ۲۰۰۲ء	گوشۂ خالد علیگ، خصوصی مطالعہ شفق احمد صدیقی، کلام و تعارف شگفتہ نازلی
۷	اپریل تا جون ۲۰۰۲ء	گوشۂ لعل محمد پٹھان، کلام و تعارف سید رضی محمد، عنبرین حسیب عنبر
۸	دسمبر ۲۰۰۲ء	کلام و تعارف: انعام ندیم، انجم جاوید، مرزا عاصی اختر
۹	جنوری تا جون ۲۰۰۳ء	خصوصی مطالعہ: طاہرہ اقبال
۱۰	جولائی تا دسمبر ۲۰۰۳ء	تاج نمبر
۱۱	مارچ ۲۰۰۴ء	تعارف و کلام: زاہد رانکوی
۱۲	اپریل تا جون ۲۰۰۴ء	گوشۂ رئیس فاطمہ، کلام: خلش مظفر
۱۳	اکتوبر تا نومبر ۲۰۰۴ء	گوشۂ رفاقت حیات، تعارف و کلام: احمد سعید قائم خانی
۱۴	۲۰۰۵ء	گوشۂ انور خالد، تعارف و کلام: فوزیہ خان، ذکیہ غزل
۱۵	جون ۲۰۰۶ء	گوشۂ پروفیسر سحر انصاری، تعارف و کلام: نجمہ کبیر، رفیع الدین راز
۱۶	فروری ۲۰۰۷ء	انوار احمد زئی نمبر
۱۷	مارچ تا جون ۲۰۰۸ء	گوشۂ ڈاکٹر محمد مسعود احمدؒ، تعارف و کلام: یعقوب خاور، کاشف حسین غائر
۱۸	دسمبر ۲۰۰۸ء	گوشۂ ذیشان ساحل

۱۹	جون ۲۰۰۹ء	گوشۂ احمد ہمیش،
۲۰	جنوری ۲۰۱۰ء	گوشۂ احسن سلیم
۲۱	اگست ۲۰۱۰ء	عمومی شمارہ
۲۲۔۲۳	جنوری تا جون ۲۰۱۱ء	گوشے: معصومہ ریازی، ڈاکٹر رضی محمد، ظہیر اقبال زیدی
۲۴	جنوری تا مارچ ۲۰۱۳	تاج نمبر
۲۵	دسمبر ۲۰۱۳ء	''بادہ و ساغر'' از سید شاہ محمد ذوقیؒ (تصوف کا پہلا اردو ناول)

☆☆☆☆☆

سید شاہ محمد ذوقیؒ کی کتب

۱۔ سرِّ دلبراں (۱۶۰۰ سے زائد اصطلاحاتِ تصوف کی تعریف و تشریح)

۲۔ تربیت العشّاق (ملفوظات ذوقیؒ)

۳۔ مضامین ذوقیؒ (اردو)

۴۔ مضامین ذوقیؒ (انگریزی)

۵۔ سفرنامۂ حج

۶۔ صوفی ازم (انگریزی)

۷۔ شمامۃ العنبر (ملفوظات وارث حسن شاہؒ)